سامراج کی موت

فرانز فینن

مترجم: خالد محمود ایڈووکیٹ

An Urdu Translation of

"A Dying Colonialism"

By: Frantz Fanon

نام کتاب	:	سامراج کی موت
مصنف	:	فرانز فینن
مترجم	:	خالد محمود ایڈووکیٹ
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرر	:	فکشن ہاؤس لاہور
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	ریاض ظہور
اشاعت	:	2012ء
قیمت	:	-/200روپے

تقسیم کنندہ:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی

● لاہور ● حیدر آباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

مشرقی قوموں کے نام!

فہرست

تعارف

ہم لوگ گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں فرانز فینن کے نام اور کام سے متعارف ہوئے تھے۔ وہ بس آیا اور چھا گیا۔ اُس زمانے میں برٹرینڈ رسل، ژاں پال سارتر اور البرٹ کامیو وہ فلسفی ہے جن کا ہمارے ہاں چرچا رہتا تھا۔ مگر فینن نے جلد ہی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی۔

فرانز فینن کو یہ مقام اُس کی کتاب Les Dcimnes de la Terre کی بدولت ملا۔ یہ کتاب 1941ء میں شائع ہوئی تھی اور جلد ہی اُس نے اپنے مصنف کے براعظم یعنی افریقہ کے علاوہ ایشیا اور لاطینی امریکہ میں ___ جس کو تیسری دنیا کہنے کا بہت رواج ہو گیا تھا ___ نو آبادیاتی نظام یا اُس کی باقیات کے خلاف لڑنے والوں کے لئے بائبل کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ پھر ہمارے دوست ڈاکٹر سجاد باقر رضوی مرحوم نے ''افتادگانِ خاک'' کے عنوان سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ رضوی صاحب بتایا کرتے تھے کہ فینن کی کتاب کے نام کا یہ ترجمہ ڈاکٹر محمد اجمل نے تجویز کیا تھا۔

''افتادگانِ خاک'' کی اشاعت کے کچھ ہی عرصہ بعد سرطان کی نذر ہو جانے والے اس جواں مرگ افریقی دانش ور نے نو آبادیاتی نظام کے ہاتھوں افریقی انسان کی نفسیاتی اور ثقافتی بربادی کے تجزیے کئے تھے اور نجات کی راہ بھی دکھائی تھی۔ اُس کا موقف یہ تھا کہ نو آبادیاتی نظام تشدد کے ذریعے قائم ہوا اور تشدد کے ذریعے ہی

قائم رہا۔ اُس کو ختم بھی صرف جوابی تشدد کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔ فینن کی کتاب کا دیباچہ ژاں پال سارتر نے لکھا تھا جس کی سرپرستی جواں سال مصنف کو حاصل رہی تھی۔ اس دیباچے میں سارتر ایک نئے روپ میں سامنے آیا اور اُس نے نہایت جوشیلے اور آگ بھڑکانے والے انداز میں یہ پیغام دیا کہ نوآبادیاتی محکومی کا شکار انسان صرف تشدد اپنی حقیقی شخصیت کو پاسکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے کہا کہ جب کوئی محکوم کسی یورپی کو قتل کرتا ہے تو وہ ایک تیر سے دو شکار کرتا ہے.......... وہ نہ صرف ظالم کو ٹھکانے لگا دیتا ہے بلکہ اپنی اُس مسخ شدہ شخصیت سے بھی نجات پالیتا ہے جو نوآبادکار نے اپنے نظام جبر کے ذریعے تعمیر کی تھی۔

ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ افریقی عوام کے علاوہ اُس زمانے کے نوآزاد ایشیائی اور لاطینی امریکہ عوام کو بھی یہ نظریہ پُرکشش لگا ہوگا۔ اُس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

فرانز فینن کی زیرنظر کتاب یعنی ''سامراج کی موت'' جس کا اردو ترجمہ خالد محمود صاحب نے کیا ہے، 1959ء میں اُس وقت لکھی گئی تھی جب فرانز فینن الجزائر کے عوام کی جنگ آزادی میں عملی طور پر شریک تھا۔ آزادی کی یہ نوآبادیاتی محکومی کے خلاف سب سے زیادہ خونریز ثابت ہوئی تھی۔ فرانس الجزائر کو اپنے تسلط میں رکھنے کی احمقانہ خواہش سے مغلوب ہو کر قتل وغارت اور ظلم وتشدد کی آخری اذیت ناک حد تک چلا گیا تھا۔ الجزائر کے بہادر عوام ڈٹے رہے۔ ہزاروں لاکھوں افراد کی قربانیوں کے بعد فرانس کو بالآخر ان کے وطن سے نکلنا پڑا تھا۔

خیر، ظالم کی پسپائی کے بعد کے حالات دیکھنے کا فرانز فینن کو موقع نہ ملا۔ جوابی تشدد کا جو پیغام اُس نے دیا تھا، آپ اُس کی تفصیلات اس کتاب میں پڑھ لیں گے۔ میں یہاں ایک مختلف نکتہ کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ فینن کو امید تھی کہ جوابی تشدد کے ذریعے غلامی سے نجات پانے کے بعد ایک قسم کے تشدد کی جگہ دوسری قسم کا تشدد

نہیں لے گا۔ بلکہ مسخ شدہ نوآبادیاتی انسان کی جگہ ایک نیا انسان پیدا ہوگا جو محبت، امن اور اشتراک کا دلدادہ ہوگا۔ وہ ایک پُرامن اور خوش حال سماج بنائے گا۔

اب جبکہ ہم ''سامراج کی موت'' کے لکھے جانے کے نصف صدی بعد کی دنیا میں سانس لے رہے ہیں تو بخوبی جانتے ہیں کہ فرانز فینن کی یہ پیشین گوئی درست ثابت نہیں ہوئی۔ آزادی بعض قوموں کے لئے انصاف، خوش حالی، انسانی اور تہذیبی ترقی کا باعث نہیں بنی۔ بہت سے ملکوں میں اُس نے انتشار، بدنظمی، لوٹ مار اور قتل وغارت کو جنم دیا ہے۔

میں یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ یہ کتاب محاذِ جنگ پر لکھی گئی تھی۔ لہٰذا اس کو بڑھتے ہوئے زیادہ احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ہم پہلے ہی مذہب، آزادی، غیرت اور جانے کس کس نام پر تشدد کے گھیرے میں آئے ہوئے ہیں۔

ہاں، خالد محمود صاحب نے ترجمہ خوب کیا ہے۔ فینن کو اردو میں ڈھالنا سہل نہیں۔ سجاد باقر رضوی مرحوم اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مگر وہ اردو کے لاجواب استاد تھے۔ خالد محمود صاحب نے رواں اور سلیس ترجمہ کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قارئین کسی الجھن کا سامنا کئے بغیر کتاب کے مفاہیم اخذ کر سکتے ہیں۔

قاضی جاوید

پیش لفظ

پروفیسر فاروق اختر کے بقول تاریخ کو اگر حقوق انسانی کی تاریخ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان میں کہیں حقوق دبانے کا جذبہ کارفرما ہے تو کہیں ان کے حصول کی تمنا۔ غاصبوں نے ظلم کے پہاڑ توڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی وہاں آزادی کے متوالوں حریت و انصاف کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے گریز نہ کیا۔

فرانز فینن امریکہ میں کارائب کے مقام پر واقع جزائر اسٹیل کے سیاہ فام افراد میں سے ہے۔ استعمار کے خلاف الجزائر کی جنگ کے موقع پر وہ فرانس میں نفسیات کا تخصصی کورس (Specialization) کر رہا تھا۔ (ماہر نفسیات بننے میں اسے صرف ایک سال رہ گیا تھا) اس نے اپنی پڑھائی چھوڑ دی اور الجزائر کی تحریک آزادی میں عضویت اختیار کی۔ وہ ''المجاہد'' نامی اخبار میں مضامین لکھتا تھا۔ بعد میں اسے اطلاع دی گئی کہ وہ سرطان کے مرض میں مبتلا ہے اور چھ مہینے سے زیادہ اس کے جینے کی امید نہیں ہے۔ اس نے محاذ کے ہائی کمان کو لکھا کہ وہ چھ ماہ بعد مر جائے گا اور اب لکھنے سے عاجز آ گیا ہے۔ اسے مجاہدین کے ساتھ مورچوں میں جہاد کے لیے متعین کیا جائے اس لیے کہ میں اخبار کی میز کے پیچھے بیٹھ کر مرنا نہیں چاہتا بلکہ چاہتا ہوں کہ الجزائر کے کوہستانوں میں اپنے شہید بھائیوں کے ساتھ رہوں۔ بعد میں اس نے وصیت کی کہ اسے ''بن مہدی'' کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اور مجاہدوں نے بھی اس کی اس وصیت پر بڑی سختی سے عمل کیا۔ یہ قبرستان جزائر کا

ایک گاؤں تھا جس کی آبادی کا فرانسیسیوں نے قتل عام کیا تھا اور بعد میں اسے قبرستان میں تبدیل کر کے اس کا نام ''قبرستان شہداء'' رکھا گیا اور اس کی شہرت ''بن مہدی'' نامی ایک شہید مجاہد کے نام سے ہوئی۔ الجزائر کے اس قبرستان پر فرانسیسی قابض تھے۔ فینن نے تیونس میں مجاہدین کے ایک گردش کرنے والے سیار ہسپتال میں دم توڑ دیا لیکن چونکہ اس کی وصیت تھی کہ اسے قبرستان شہداء میں دفن کیا جائے لہٰذا مجاہدین کے ایک رجمنٹ نے اسے مخفیانہ طور پر سرحد سے الجزائر پہنچایا اور پھر اسے دشمن کے زیر نظر اس قبرستان میں سپرد خاک کیا۔

فینن کہتا ہے: دوستو! (جب وہ دوستو کہتا ہے تو اس سے اس کی مراد نہ الجزائری ہوتے ہیں، نہ افریقی اور نہ ہی جنوبی امریکہ کے جزائر اسنتیل کے لوگ، بلکہ تیسری دنیا کے وہ سارے لوگ ہوتے ہیں جو حقارت کا نشانہ بنتے ہیں اور جن کو برباد کیا گیا ہے) افریقہ سے آؤ، کہیں ہم تیسرا یورپ نہ بنا بیٹھیں۔ امریکہ کا تجربہ ہمارے لیے کافی ہے۔ امریکہ نے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو یورپ میں ڈھال دیا اور یورپ دو ہو گئے۔ یعنی لوگ اور عالمِ بشریت ایک دکھڑے کو رو رہے تھے کہ وہ دو ہو گئے۔ اور اگر مجاہدوں، روشن خیالوں اور افریقی لوگوں کا مبارزہ اس بات پر منتہی ہوا کہ افریقہ پھر ایک فرانس، ایک لندن اور ایک مغربی یورپ بنے تو پھر ہمارے تین یورپ ہوں گے۔

کیا ہم ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ سے ایک اور یورپ اور امریکہ بنانا چاہتے ہیں؟ اگر یہی بات ہے تو پھر ہم کیوں اپنے ملک کی سرنوشت کو خود اپنے ہاتھوں سے یورپی استعمار کے حوالے نہ کریں، اس لیے کہ یہ لوگ اس طرح کے تمدن کو ہم سے زیادہ بہتر انداز میں بروئے کار لا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنی سرنوشت کو خود اپنے ہاتھوں میں لیں تو ہمیں اس بات کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ جب ہم انگریزوں، فرانسیسیوں اور امریکیوں کو افریقہ اور ایشیا سے بھگا رہے ہیں تو انہیں دروازے سے باہر نکال کر کھڑکی سے واپس لائیں

اور ان کی نگاہ، ان کے قانون، ان کی تنظیم، ان کے تمدن اور ان کی فکر کو دوبارہ پلٹائیں اور صرف اس بات پر خوش ہوں کہ جن امور کو فرانس اور امریکہ انجام دے رہے تھے اب ہم خود انجام دے رہے ہیں۔ ہم ایشیا اور امریکہ میں اس المیہ کو انجام دینے کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں کہ جس کا نام تمدن ہے، تاکہ صرف چہروں کو بدلیں، یعنی بھورے بالوں والے افراد کی جگہ کالے بالوں والے افراد کو رکھیں۔ ہم۔۔۔ تیسری دنیا کے روشن خیال لوگ۔۔۔ اس لیے نہیں اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں کہ صرف استعمار کو چلتا کریں، اس لیے قیام نہیں کیا ہے کہ آدمیوں کی جگہ بدلیں، اس لیے قدم نہیں اٹھایا ہے کہ مغربی تمدن کو مشرق میں پھر سے تازہ کریں۔ یہ نہ تو افریقہ اور ایشیا کی کوئی خدمت ہے اور نہ عالم بشریت کی۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں، بشریت نے ایک دفعہ پھر جو کچھ کھایا ہے اسے اُگل دے گی۔ اور اگر ہم افریقہ اور ایشیا میں ایک اور امریکہ اور یورپ بنا ڈالیں تو یورپ اور امریکہ اپنے استفراغ یا اپنی مسخ شدہ صورت کو دیکھیں گے اور یہ نہ بشریت کی خدمت ہے نہ استعمار کی اور نہ ہی یورپ و تمدن کی۔ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ مغربی تمدن کی سب سے بڑی قربانی انسان ہے۔ لہٰذا تیسری دنیا کے روشن خیال لوگوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس راہ کو اختیار کریں کہ جو انسان کے مسخ پر منتہی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم روشن خیال لوگ اس لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں کہ افریقہ اور ایشیا سے ایک جہانِ نو تعمیر کریں، ایک نئے نظام اور نئے تمدن کو ابھاریں اور کوشش کریں کہ ایک نیا انسان، ایک نئی نسل اور ایک نئی فکر خلق ہو، نہ وہ انسان کہ جو مغرب کی اس تیزی سے بڑھنے والی پیداواری رقابتی نظام میں مسخ ہو۔ اس جنوں آمیز سرعت میں جسے سرمایہ داری اور سرمایہ داری کی صنعت نے انسان پر مسلط کیا ہے سب ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں ہیں اور اس کیفیت میں کوئی اپنے نزدیک رہنے والے کے حال کو نہیں پوچھتا اور کوئی اپنے بازو کے انسان کو نہیں دیکھتا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس جنوں آمیز دوڑ کو رُک کریں اور آدمی کی تعمیر، آدمی کی شناخت اور آدمی کی نجات کے لیے کام کریں تاکہ یہ

بشر ایک نیا انسان بنے اور یہ نیا پوست اور نئی چمڑی ایک نئی نسل کے عنوان سے۔۔۔ نہ کہ سفید وسیاہ وزرد وسرخ کے عنوان سے۔۔۔ کہ جس کا نام انسانی نسل ہے ایک بار پھر صورت اختیار کرے۔ اور اس کے لیے ایک طوفان نوح کی ضرورت ہے وہ طوفان کہ جو ہر برائی، ہر ناشائستہ تمدن اور ہر اُس انسان دشمن بنیاد کو جو روئے زمین پر مبنی ہے اپنے اندر غرق کر دے اور اس کے بعد ایک دھلی دھلائی، صاف اور پاکیزہ انسانی نسل باقی رہے اور وہ آدمی کے تکامل (ارتقا) کے عمل کو ابتدا سے۔۔۔ مگر صحیح طور پر۔۔۔ شروع کر دے، اور یہ تیسری دنیا کے روشن خیال لوگوں کی عظیم مسئولیت ہے کہ جو صرف ان کی آزادی اور استقلال پر منتہی نہیں ہوتی، صرف استعمار سے مبارزہ ان کی مسئولیت کو ختم نہیں کرتا، بلکہ یہ مسئولیت آنے والے کل کے انسان کے لیے ہے، اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم آج کے انسان کو نجات دیں، نہ یہ کہ اسے یورپ تک پہنچائیں اس لیے کہ یہ ہمارا آئیڈیل نہیں ہے۔ یہ نئی نسل کہ جسے بننا ہے اور جسے سفید وزرد وسرخ وسیاہ کا جانشین بننا ہے کس طرح کی نسل ہے؟ اور یہ سوچ کہ اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے، کیسی سوچ ہے؟ مجھے یقین ہے کہ مشرقی؛ روشن خیال افراد کے عنوان سے اس وقت ہمارے اس طرح کے انسان کی تعمیر کے لیے ہر طرح کا ساز وسامان ہے اور یہ ساز وسامان عبادت ہے ڈھانچہ کے اعتبار سے مغربی تمدن۔۔۔ جس کے آج ہم فریفتہ ہیں۔۔۔ اور روح کے اعتبار سے مشرقی ثقافت اور وہ پاکیزہ مذہب کہ جو ان خرافات کے نیچے دفن ہو گئی ہے اور سارے روشن خیال لوگ اس سے بیزار ہیں۔ یہ دونوں مل کر اس طرح کے انسان کو بنا سکتے ہیں۔ اس طرح کا متمدن انسان کہ جو عشق کو بھی سمجھے اور ایسی طاقت اور ایسی فضیلت کا حامل بھی ہو کہ جو تمدن کی طاقت کے پیروں تلے پامال نہ ہو بلکہ اس طاقت کو انسانی روح اور انسانی تکامل کے کلام میں لائے۔

یہ وہ انسان نہیں جو ان مصارف کے پیروں تلے کچلا جانے والا ذلیل وخوار غلام ہو جسے سرمایہ داری آئے دن اس پر مسلط کرتی ہے اور ایسا انسان بھی نہیں کہ جسے مشین ایک کچلنے

والی شے کی طرح اسے کچل دے بلکہ وہ ایک آقا اور سوامی ہے، مشین کا غلام نہیں مالک ہے اور اس کیفیت میں مشین انسان کا نجات دہندہ ہو گا۔ اس موقع پر وہ خود آگاہ اور تکامل یافتہ انسان کو جو انسانی روح واحساس کا حامل ہے، اگر اس کے پاس مشین بھی ہو تو وہ بجائے اس کے کہ اپنی روزمرہ کی زندگی کے لیے دس گھنٹے صرف کرے، صرف دو گھنٹے اس کے لیے کافی ہوں گے اور باقی آٹھ گھنٹے وہ آزاد ہو گا اور اس آٹھ گھنٹے کی آزادی میں اسے موقع ملے گا کہ وہ غور وفکر، معنوی رشد وتکامل اور تاریخ میں انسان سازی پر کاربند ہو۔

یہاں، ہم قارئین کی سہولت کے لیے کتاب ہذا یعنی ''سامراج کی موت'' کے مختلف ابواب کا مرکزی خیال اختصار کے ساتھ بیان کیے دیتے ہیں تاکہ اہل حسن وذوق کو اس کی تفہیم وتہذیب میں کسی طرح کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

فینن نے ماہر نفسیات ہونے کے ناطے جس قربت سے مقامی لوگوں کے حالات و واقعات کا مشاہدہ کیا اسی خوبصورتی سے سامراجی حکمرانوں کی منافقت کا پردہ چاک کر دیا۔ اس نے اپنے استدلال کے دوران کسی لگی لپٹی سے کام نہ لیا پہلے باب میں فاضل مصنف بتاتا ہے کہ کس طرح سامراج نے مقامی لوگوں کا ناطقہ بند کیا اور اپنی ٹیکنالوجی کا فائدہ اٹھا کر اس وقت کے جدید ترین میڈیا ریڈیو کو اپنی ثقافتی یلغار کا آلہ کار بنایا اور اس معاملے میں کس طرح مقامی لوگوں نے اپنے حسن ذوق سے قومی ریڈیو سروس جاری کر کے اس چیلنج کا مقابلہ کیا جس پر ان کے اپنے حالات، مقامی ثقافت کے پروگرام اور دیگر کا پرچار کیا جاتا۔

اسی طرح ''دریدہ دامن الجزائر'' میں فاضل مصنف نے بتایا کہ سامراج کی آمد سے قبل عورت پردے میں رہ کر اپنی عزت وعصمت کا تحفظ کرتی تھی۔ استعمار نے مقامی لوگوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے لیے عورتوں کو آلۂ کار بنایا۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ جب تک عورت کو شمع محفل نہیں بنایا جاتا مقامی تہذیب کو بگاڑنا ممکن نہیں۔

گو کہ آغاز میں بدیس حکمرانوں کو ایک حد تک کامیابی بھی ملی۔ انہوں نے تعلیم وصحت کے نام پر ایسے ادارے بنائے جہاں عورتوں کو ملازم رکھا جاتا اور ساتھ ساتھ سماجی پروگرام مرتب کیے جاتے جن میں آزادیٔ نسواں کے نت نئے نظریات کا پرچار کیا جاتا۔ جب گورے حکمران سرکاری سطح پر کوئی پروگرام یا تقریب مناتے تو مقامی ماتحت کو طعنے دیتے کہ آپ اپنی زوجہ حیات کو ساتھ لے کر کیوں نہیں آئے۔ مقامی عورت نے آزادی کی اس دعوت پر وقتی طور پر لبیک کیا لیکن ادھر لبریشن فرنٹ جو قوم کی اجتماعی بقا کے لیے سامراج سے پنجہ آزما تھا، نے عورت کو احساس دلایا کہ یہ سرگرمیاں اس کی آزادی کی ضامن نہیں بلکہ انہیں غلامی کی بدترین شکل میں جکڑا جا رہا ہے جو انہیں اپنے آپ سے بیگانہ کر دے گی۔

مقامی عورت نے قائدین آزادی کی آواز پورے دل سے سنی اور مجاہدین کے شانہ بشانہ میدان کارزار میں کود گئیں۔

عظیم اسلامی روایات کا پرچار کرتے ہوئے انہوں نے میدان جنگ میں ملت کی فلاح کے لیے اپنا کردار ادا کیا۔ اسلامی عسکری تربیت حاصل کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اسی طرح انسان دوست مصنف نے اگلے باب میں واضح کیا ہے کہ جب جدوجہد آزادی میں عسکریت پسند بڑی تعداد میں زخمی ہونے لگے تو غاصب حکمرانوں نے ویکسین جیسی جراثیم کش ادویات کی فراہمی پر پابندی عائد کر دی۔ جس کے نتیجے میں ہزاروں مجاہدین متاثر ہوئے۔ لیکن عسکری قیادت نے اس چیلنج کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کیا اور ہمسایہ ممالک تیونس، مراکش اور مصر سے ادویات کی فراہمی کو یقینی بنا کر مجاہدین کی بقا کا سامان کیا۔

آج مغرب نے دہشت گردی کی آڑ میں عالم اسلام کے خلاف جارحیت شروع کر رکھی ہے وہ اسی سلسلے کی کڑی ہے:۔

نہ رزم گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

سائنس ٹیکنالوجی میں جدت سے قطع نظر اگر حالات و واقعات کا بخوبی جائزہ لیا جائے اور ہتھکنڈوں کی آڑ میں بھی وہی محرکات نظر آتے ہیں جن کے تحت مغرب نے گزشتہ صدی میں ملت بیضا کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا۔

ڈاکٹر علی شریعتی کے بقول مغربی استعمار کی خطرناک ترین ناشناختہ ترین اور پوشیدہ ترین شکل اس کا ثقافتی اور فکری امپلر یلزم ہے جو پہلے تو دیگر اقوام کی فکر، تعصب اور سوچ کو ختم کرتا ہے، دوسرے معاشروں میں اپنا نفوذ کرنے اور اپنی بنیادوں کو مستحکم کرنے کی بھرپور ابتدائی کوششوں کے بعد اقتصادی اور فوجی یلغار کرتا ہے۔ ثقافتی لبرلزم ہی استعمار کی خاطر فوجی چڑھائی کرنے کے ذریعے مکمل قبضہ راستہ ہموار کرتا ہے۔

شریعتی کے مطابق استعمار بلی کی طرح بڑے آرام سے، دبے پاؤں اور آہستہ کے ساتھ افریقہ میں داخل ہوا، کوئی نہ سمجھ سکا کہ کب اور کہاں سے داخل ہوا، جب افریقہ کے لوگوں نے اس بات کو سمجھا تو انہوں نے دیکھا کہ اس کی چوتھی پانچویں اور چھٹی نسل ہے اور اس نے ہزاروں بچے پیدا کر دیے ہیں اور جب افریقیوں کو عقل آئی تو انہوں نے دیکھا کہ بات اس پر ہو رہی تھی کہ آیا اپنے ملک پر حکومت کرنے کے لیے خود افریقی بھی حق رائے دہی رکھتے ہیں یا نہیں۔

مشرقی اقوام کو ان کی تہذیب وثقافت اور اقدار وروایات سے خالی کرنے کے لیے مغربی استعمار مختلف حیلے اور حربے استعمال کرتا ہے۔ شریعتی کے بقول ''مغرب اٹھارہویں صدی سے اپنے ماہرین عمرانیات، مورخوں، مصنفین، فن کاروں حتیٰ کہ انقلابی شخصیتوں اور انسان دوست افراد کی معرفت یہ تھیوری دنیا پر ٹھونسنا چاہتا ہے کہ واحد تمدن وہی ہے جو مغرب نے بنایا ہے اور جو کوئی بھی متمدن کہلانا چاہتا ہے اسی تمدن کو بروئے کار رائے جو مغرب نے بنایا ہے ورنہ وہ وحشی رہے گا۔ جس طرح سے وہ یورپین مصنوعات اور ٹیلی

ویژن وغیرہ کا مصرف کنندہ ہے اسی طرح سے اسے مغربی تمدن کا بھی مصرف کنندہ ہونا چاہیے۔ آخری دو صدیوں میں مغرب کی یہی کوشش رہی ہے کہ اقوام کو مغربی تہذیب و تمدن پر ایمان لانے والا اور اپنے آپ کے متعلق بے ایمان بنایا جائے۔ وہ تمام گذشتہ تمدنوں کی نفی کر کے اپنے تیار کردہ تمدنی اور ثقافتی سانچوں کو تمام دنیا پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ یہ قتل عام اور تباہی وہ چین سے لے کر ایران اور ایران سے لے کر مصر تک جو کہ عظیم تمدنوں کے خالق ہیں، سب ممالک پر عائد کرنا چاہتے ہیں۔"

1960ء کی دہائی تک اگرچہ بظاہر پوری دنیا سے نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہو گیا لیکن سائنسی اور فکری برتری ہونے کی وجہ سے مغرب اور امریکہ بہادر کی نظریں ایک مرتبہ پھر مشرق کی دوات پر للچائیں اور عربوں کے پاس تیل جیسی دولت دیکھ کر ان کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ انہوں نے سرد جنگ کی آڑ میں پھر افریقی اور ایشیائی ممالک کے خلاف جنگ مسلط کر دی لیکن اب وقت تبدیل ہو چکا ہے۔ بظاہراً کسی ملک پر جبراً قبضہ نہیں کیا جا سکتا یہ کام سرد جنگ کے دوران تیسری دنیا کے حکمرانوں اور فوجی آمر ٹولے نے آسان کر دیا۔ اس دوران امریکہ نے کوریا، ویتنام، فلپائن، انڈونیشیا، پاکستان اور عربوں کی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹی اور رہی سہی کسر قیام امن کے نام نہاد علمبردار عالمی ادارے اقوام متحدہ نے پوری کر دی۔ اس ادارے نے کمزور قوموں کی حمایت کرنے کے بجائے استعمار کے گماشتوں کو چھتری فراہم کی اور یہ کہ برطانیہ اگرچہ دوسری جنگ میں قدرے کمزور ہو چکا تھا کہ اس میں اپنی کالونیوں کو برقرار رکھنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا۔ یہ کام صاحب بہادر امریکہ نے پورا کر دیا۔ سائنسی تحقیق، سیاسی وحدت اور بے پناہ عسکری قوت کے زور پر دنیا پر اپنا رعب جمانے چلا لیکن اسے قوموں کے مزاج کو سمجھنے اور لوٹ مار کرنے میں ذرا دقت پیش آئی جو برطانیہ نے اپنے تاریخی ورثے کی پیشکش کر کے مسئلہ حل کر دیا۔

امریکہ بہادر نے اپنے برطانوی آقا کو چراغ راہ بنا کر مشرقی دولت پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے چڑھائی کی کیونکہ گورے انگریزوں کو ایشیائی اور افریقی تسلط کے دوران ان لوگوں نے انفراد اور اجتماعی حالات سے بخوبی واقفیت تھی لہٰذا سرد جنگ کے دوران امریکی مکاروں نے اسلامی دنیا کو اعتماد میں لے کر میڈیا اور چھتری اور عرب دنیا سے نام نہاد کرائے کے دانشور خرید کر اسلامی احکامات کی تعبیر اپنے نقطہ نظر کے مطابق کروائی کہ مغربی قومیں عیسائی مذہب کی پیروکار ہونے کے ناطے مسلمانوں کی طرح ایک خدا پر یقین رکھتی ہیں لیکن اس کے برعکس روس جہاں 1934ء میں کمیونسٹ اِنقلاب آچکا تھا سرمایہ داری کے خلاف سب سے بڑی آواز تھی۔ مغرب نے اس باغی طاقت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عالم اسلامی کو اعتماد میں لینا مناسب خیال کیا۔ یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے ہم کہنا چاہیں گے کہ استعمال نے بالکل وہی حکمت عملی جو اس نے 1916ء میں ترکوں کے خلاف محاذ آرائی کے دوران عربوں کو اکسایا۔ بالکل اس نہج پر امریکہ نے مسلمانوں کو اعتماد میں لے کر ان کی مذہبی تعبیرات سے سرمایہ دارانہ نظام کا جواز گھڑا۔ عربوں اور دیگر اسلامی ممالک کے تمام وسائل اپنے مضموم مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیے۔ اس دور میں کوئی بھی دیدہ اور صاحب ایسا نہ ہوا جو صاحب بہادر امریکہ کی اس چال کو بے نقاب کرتا۔ عالم اسلامی میں گرچہ چیدہ چیدہ لوگوں نے انفرادی سطح پر دین مروت کے خلاف اس سازش کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں یا تو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے یا پھر غداری کے الزام میں ملک بدر ہونا پڑا:

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

1992ء میں سوویت یونین کے انتشار یعنی Disintegration کے بعد دنیا میں طاقت کا توازن خراب ہو گیا اور امریکہ بہادر واحد استعماری قوت کے طور پر سامنے آیا۔ پھر

اس نے ہروہ کام کیا جس پر اس کی نظر للچائی۔

استعمار کے زرخرید دانشوروں اور تمام عالمی اداروں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ ایک موقع پرست کی طرح امریکہ نے سوویت یونین بکھرنے کے بعد اپنے مسلمان اتحادیوں اور ''مجاہدین'' سے آنکھیں پھیر لیں۔ کل تک جو اس کی آنکھ کا تارا تھے آج وہ دہشت گرد بن گئے۔ بقول غالب ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اس دور کے نام سیموئل ہنگٹن اور فرانس فو کو یاما جیسے مغربی دانشوروں نے (Calsh of Civilization) تہذیبوں کا تصادم اور "End of History" (تاریخ کا اختتام) جیسے نام نہاد مقالے لکھ کر پورے یورپ کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا دیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ امریکی انتظامیہ نے ان دانشوروں سے خود ایسے مضامین لکھوائے تاکہ اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے جواز مہیا کر سکیں۔ تہذیبوں کے تصادم میں Samual Huntington نے اپنے ناقص استدلال کی بناء پر ثابت کر دیا کہ دنیا میں کل اور تہذیبیں تھیں جو کہ وقت گزرنے کے ساتھ دم توڑ گئیں اور ڈارون کے نظریہ ارتقا کے سنہری اصول (Struggle for Existance) کے تحت ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو کر صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی میں چند تہذیبیں سامنے آئیں۔ ان میں مغربی، روسی اور اسلامی تہذیب کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ آگے چل کر مقالہ نگار لکھتا ہے کہ سوویت یونین کو ہم نے شکست دے دی اب ہمارے سامنے ایک ہی ہدف ہے اور وہ ہے اسلامی تہذیب۔ اسے ہم اپنے فریم ورک میں لانے کی کوشش کریں گے، اگر اس نے اطاعت قبول کر لی تو اس میں اس کی بہتری ہے بصورت دیگر اسے براہ راست نشانہ بنایا جائے گا۔ اس کے بعد ہنگٹن عصر حاضر کا میکیاولی اپنے صلیبی پیروکاروں کو مشورہ دیتا ہے کہ دنیا میں اسلامی

تہذیبوں کے علاوہ کئی طاقت ور ملک بھی ہیں جو مغربی گماشتوں کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس کا علاج یہ شیطان صفت دانشور یہ بتایا ہے ''ہم ان کے ساتھ فرض ہے کہ بڑی طاقتوں کے ساتھ تصادم کے بجائے مفاہمت کا رویہ اپنانا ہوگا تاکہ انہیں ہمارے دشمنوں کے ساتھ ملنے سے روکا جا سکے۔ اب ظاہر ہے کہ دشمن کون ہیں۔''

یہ وہ ابلیسی منشور ہے جس پر امریکہ بہادر اور اس کے صلیبی حواری پوری تن دہی سے عمل پیرا ہیں۔ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اول الذکر سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی ورثہ موخر الذکر سے بالکل مختلف ہے۔ لہٰذا عالم اسلام کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ یا تو مغربی اقدار پر لبیک کہے یا پھر گستاخی کی سزا کے لیے تیار رہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ پورا عالم اسلام میدان جنگ بنا ہوا ہے۔ ایک طرف اپنوں کی بے حسی اور دوسری طرف غیروں کی عیاری۔ امریکہ نے عراق، افغانستان کو تباہی کے دھانے پر پہنچا دیا۔ پوری مہذب دنیا میں احتجاج ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک دن میں پانچ براعظموں میں 80 لاکھ افراد نے جنگ کی ہولناکی کے خلاف مظاہرے کیے لیکن امریکہ نے طاقت کے نشے میں ایک نہ سنی اور عراق کے خلاف ایٹمی اور حیاتیاتی ہتھیاروں (Biological Weapons) کا جھوٹا پراپیگنڈا کیا اور پھر اقوام متحدہ کی چھتری کو استعمال کرتے ہوئے انتہائی جارحانہ طریقے سے نہ صرف عراقی حکومت کا تختہ الٹ دیا بلکہ صدام حسین کو مسلمانوں کے مذہبی تہوار عیدالاضحیٰ کے موقع پر تختہ دار لٹکا دیا۔ اور اسی حال ہی میں لیبیا کے صدر کرنل قذافی کا عبرتناک انجام سے دوچار کیا: ؎

موسم آیا تو نخل دار پر میر
سر منصور ہی کا بار آیا

اس وقت عالمی شطرنج کی بساط پر عجیب و غریب قسم کی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ان میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اپنے منطقی جواز سے ہٹ کر ہو رہی ہو۔ شمالی کوریا عالمی دباؤ اور

معاشی پابندیوں سے تنگ آ کر 13 فروری 2007ء کو چین کے دار الحکومت بیجنگ میں ہونے والے چھ ملکی مذاکرات میں اپنا ایٹمی پروگرام بند کرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔

شمالی کوریا کے ساتھ معاہدہ جنگ بندی طے پا جانے کے بعد وہاں مقیم نہ صرف فوجی دستوں کی تعداد میں کمی کر دی جائے گی بلکہ ساز و سامان کی بھی بچت ہو جائے گی۔ اس کے بعد اتحادی طاقتیں ایران کا گھیراؤ مزید تنگ کرنے کے لیے اپنی پٹاریوں سے سانپ نکالیں گی اور ظالمانہ سرکس کا نیا کھیل شروع کر کے ایرانی خون سے ہولی کھیلیں گی جس طرح انہوں نے تمام عالمی قیام امن کی آڑ میں نام نہاد دہشت گردی کے خلاف محاذ آرائی کی۔ اس کے برعکس ایران بیسیوں مرتبہ عالمی محاذ پر اقوام متحدہ کے ایٹمی توانائی کے عالمی ادارے اور یورپی یونین کو یقین دہانی کرانے کی ناکام کوششیں کر چکا ہے کہ ہمارا مقصد یورینیم افزودگی سے ایٹمی ہتھیاروں کا حصول نہیں بلکہ اس کے ذریعے ہم اپنی صنعتی ضروریات پوری کرنا چاہتے ہیں تاکہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں اپنی بقاء کے لیے وسائل فراہم کر کے اپنی داخلی اور معاشی کمزوریوں کا ازالہ کر سکیں لیکن امریکہ بہادر طاقت کے نشے میں ایک ہی بات پر بضد ہے کہ ایران غیر مشروط طور پر اپنا ایٹمی پروگرام ختم کرنے کا اعلان کرے کیونکہ ایران کا ایٹمی پروگرام خطے میں قیام امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس جنگی جنونی کو کون سمجھائے کہ خطرہ ایران نہیں بلکہ اسرائیل ہے جس نے گذشتہ نصف صدی میں نہ صرف عربوں کے خلاف مسلسل 1948ء سے 1967ء اور 1973ء میں ناحق جنگیں مسلط کیں بلکہ اس دوران صابرہ اور اشبیلیہ کے کیمپوں میں ہزاروں نہتے فلسطینیوں کے خون سے ہولی کھیلی اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

آخر میں ہم اپنے قارئین کی سہولت کے لیے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ یہ کتاب اگرچہ 1960ء کی دہائی میں لکھی گئی لیکن قرآن حکیم کے معجزاتی اور عالمگیر پیغام کے مطابق

(وذکرھم بایام اللہ، ان فی ذلک لآیت لکل صبار شکور) یعنی ان سے اللہ کے دنوں (تاریخ) کا ذکر کرو بے شک اس میں صبر اور شکر کرنے والوں کے لیے بے شمار نشانیاں مضمر ہیں۔

یہ کتاب الجزائر کے پس منظر میں لکھی گئی جہاں فرانسیسی استعمار قابض تھا۔ اس کے برعکس آج ہمیں امریکی استعمار کا سامنا ہے۔ لیکن اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو دونوں میں بہت سی Similarities پائی جاتی ہیں۔ دونوں کا مقصد غیروں کی دولت لوٹنا، لوگوں کو غلام بنانا تھا، دونوں نے مقامی لوگوں کے خلاف پابندیاں عائد کیں۔ الجزائر، تیونس اور مراکش میں فرانسیسیوں نے ادویات پر پابندی عائد کی۔ عراق میں ایسی پابندیوں کی وجہ سے لاکھوں عراقی بچے موت کی نیند سو گئے۔ الجزائر میں ظلم و ستم کی حد کی گئی لیکن مجاہدین رکاوٹ بنے رہے، افغانستان اور عراق میں بھی سخت قسم کی مزاحمت جاری ہے۔ روزانہ سینکڑوں شہادتیں ہو رہی ہیں لیکن الحمد للہ ابھی تک مجاہدین کے پایہ استقلال میں لرزش نہیں واقع ہوئی۔

اسی طرح شام کو گذشتہ کئی مہینوں سے ایک باغی ٹولے کی یلغار کا سامنا ہے۔ حکومت کی تمام تر یقین دہانیوں کے باوجود وہ اپنے ''آقا'' کے پڑھائے ہوئے ایک ہی سبق پر بضد ہیں کہ شامی صدر بشار الاسد غیر مشروط طور پر اپنے عہدے سے دستبردار ہو جائے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ حالات مزید خراب ہو رہے ہیں۔ اس سارے شیطانی کھیل کے پیچھے مغربی قوتوں کا نہ نظر آنے والا ہاتھ کارفرما ہے جو ہر وقت اپنے مفادات اور ہوس کی تکمیل کے لئے متحرک رہتا ہے اور قوموں کو رزم آرائی پہ ابھارتا رہتا ہے۔ تاکہ اس کی آڑ میں اپنے معاشی مفادات کا تحفظ کر سکے۔

اسی طرح وطن عزیز کو بھی آج کل انہی حالات کا سامنا ہے کہ ایک طرف امریکہ بہادر نام نہاد دہشت گردی کے خلاف نبرد آزما ہے اور دوسری طرف اپنے ہی اتحادی اس کے ''غم و غصہ'' اور بربریت کا شکار ہو رہے ہیں۔

معاشی طور پر پاکستان انرجی کے بحران اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زرعی اور صنعتی مفلوک الحالی سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔ رہی سہی کسر حکمرانوں کی بدعنوانی نے نکال دی۔ اس لٹے پٹے قافلے پر امریکہ بہادر نے ڈرون حملے کر کے جس طرح پاکستان کی سالمیت، خودداری اور اجتماعی خودی کو نقصان پہنچایا ہے وہ نا قابل تلافی ہے۔ تمام تر یقین دہانیوں اور عسکری تعاون کے باوجود ''صاحب بہادر'' کا کوڑا ہماری پیٹھ پر ہی برستا ہے۔ چند ماہ قبل امریکہ نے تمام تر سفارتی اور بین الاقوام کو پس پردہ رکھ کر ایبٹ آباد آپریشن کر کے ہماری خودمختاری کو چیلنج کیا اور اس پر صبر نہ آیا تو شمالی علاقہ جات میں واقع مہمند ایجنسی کی دو چوکیوں پر 26- نومبر 2011ء کی رات نیٹو گن شپ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے جارحیت کر کے 24 فوجی جوانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ مہذب ممالک کے احتجاج کے باوجود امریکہ بہادر اپنی بربریت پر نہ معذرت کو تیار ہے اور نہ مزید یلغار سے باز رہنے پر آمادہ نظر آتا ہے:۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر میرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

امریکی اور یورپی استعمار کا اگلا ہدف ایران شام اور پاکستان ہے۔ لیکن حکمرانوں سمیت پوری قوم خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہے۔ ہم نے حق کا ساتھ دینے کے بجائے طاغوت کا ساتھ دیا اور اپنے دین مروت. اور ملت بیضا کے خلاف بغاوت کی۔ یہ نہ سوچا کہ ایسی لاپرواہیوں اور خود غرضیوں کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ فکر اقبال کے مطابق:۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

آج بھی وقت ہے کہ ہم اپنا قبلہ (Direction) درست کریں۔ سابقہ غلطیوں کا

ازالہ کر کے مستقبل کے لیے استعمار سے پنجہ آزمائی کی تیاری کریں۔ اگر عراقی اور شامی عرب اپنے شعراء کی آواز پر لبیک کہہ کر میدان کارزار گرم کر سکتے ہیں تو آج بھی ڈاکٹر اقبال کی روح استعمار کے خلاف پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ:۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومان یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ورنہ تہذیب کے اوزار ہیں دونوں، تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے رہو تم
تم نے توڑے نہیں کیا کمزور قوموں کے زجاج
آل سیزر چوب نے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشت دہقاں، تم نے لوٹے تخت و تاج
پردہ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

(ضرب کلیم)

آج ہم قرآن و سنت اور فکر اقبال کو چراغ راہ بنا کر میدان کارزار میں اُتریں اور اپنے آپ کو جدید اسلحے سے لیس کر کے دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں تو کامیابی ہمارے قدم چومے گی اور فتح ہمارا مقدر ہو گی لیکن اس کے برعکس اگر اپنی کمزوریاں اور کوتاہیاں دور نہ کیں اپنی صفحوں میں اتحاد کے بجائے افتراق پیدا کیا اور مختار مسعود کے بقول جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو دی، ملک کے بجائے مفاد عزیز رکھا اور ملت کے

بجائے مصلحت پر قربان ہوئے تو پھر اس کے نتائج پر بھی ہمیں آنسو بہانے کا کوئی حق نہیں ، اقبالؔ نے سچ ہی تو کہا تھا ۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے ہندوستان والو
تمہاری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں

خاکسار

خالد محمود ایڈووکیٹ

جنوری 2012ء

دیباچہ

آزادی الجزائر کے لئے لڑی جانے والی جنگ چھٹے سال میں داخل ہونے والی ہے (واضح رہے کہ فینن نے یہ کتاب 1959ء میں لکھی تھی) ہم میں سے کسی ایک شخص کو یہ گمان تک نہ تھا کہ ساٹھ ماہ کی اس ازم آرائی کے بعد بھی فرانس اسی ڈھٹائی کے ساتھ اپنے خونی پنجے الجزائر کی سرزمین میں گاڑے رکھے گا اور مقامی لوگوں کی آواز کو اٹھنے نہیں دے گا۔ جدوجہد آزادی کے سال بعد بھی کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئی۔ فرانسیسی حکام مسلسل بضد ہیں کہ الجزائر پر ان کا حق ہے۔ اس جنگ نے پورے الجزائر کو خواب خرگوش سے بیدار کر دیا ہے اور اب لوگ اپنے کم و بیش تمام وسائل اور چھپے ہوئے خزانوں کو لے کر سامراج کے ساتھ پنجہ آزمائی کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ اس دوران انہوں نے اپنے غیر ملکی آقاؤں سے کوئی اظہار ہمدردی کا تقاضا نہیں کیا اس کے لئے کہ سامراج نے شاید انہیں ایسا کرنے کی اجازت ہی نہ دی۔

الجزائر کی سرزمین پر سامراج کے خلاف تاریخ کی خطرناک جنگ لڑی جا رہی ہے۔ تحریک آزادی کے مخالفین کا دعویٰ ہے کہ جنگ کی قیادت کرنے والے لوگ نہتے عوام کے خون کے پیاسے ہیں۔ دوسری طرف جمہور نواز قوتوں کا استدلال ہے لبریشن فرنٹ کی قیادت اپنے لوگوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک کر سخت غلطی کا ارتکاب کر رہی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اب تحریکی قیادت لوگوں کی ان باتوں پر کان دھرے تو کیا وہ ظالم اور جابر

سامراج کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھ سکتی ہے۔

حقیقت یہ کہ جب لبریشن فرنٹ آزادی کی جنگ کے لئے فرانسیسی فوجوں سے نبرد آزما تھا تو اس نے اپنے فوجی دستوں کو اس بات کی پوری تلقین کی کہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے تم دشمن کے دستوں اور ٹھکانوں کو نشانہ ضرور بناؤ لیکن اس حقیقت اور اصول کو کبھی فراموش نہ کرنا کیونکہ اپنے عظیم مقصد کے حصول کے لئے ناجائز ذرائع کا استعمال اچھائی کے بجائے مزید ظلم و بربریت کی طرف لے جاتا ہے۔

اگر مغربی اقوام کارزار حیات میں ظلم و تشدد کا بازار گرم رکھتی ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ اپنے نظریے کے ساتھ مخلص اور وفادار نہیں ہے اور اگر تیسری دنیا کی تحریکیں اپنے مقصد کے حصول کے لئے تشدد کی مرتکب ہوتی ہیں تو ان پر بربراور ظلم ہونے کا الزام دھر دیا جائے گا۔لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ازم حق و باطل کے دوران اپنے اخلاقی اصولوں کی پاسداری ممکن ہے؟ اس کے لئے ہم الجزائر کے ایک ڈاکٹر کا واقع پیش کرتے ہیں جس نے اپنی پیشہ ورانہ کارکردگی کے دوران انتہائی ایمانداری اور فرض شناسی کا مظاہرہ کیا۔ہوایوں کہ ایک محاذ پر دشمن کے 30 فوجیوں نے اسلحہ ختم ہونے پر ہتھیار پھینک دیئے۔ مجاہدین نے انہیں گرفتار کر کے انہیں زدوکوب کیا لیکن ڈاکٹر نے اس دوران قیدیوں کو نہ صرف مزید تشدد سے بچایا بلکہ انہیں ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے کے لئے ہنگامی حالت میں دشوارترین راستے سے قیدیوں کے کیمپ روانہ کیا۔اس دوران دو الجزائری مجاہدوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔اسی طرح ایک فوجی دستے کو دشمن کے قیدیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم ملا، اسی دوران مجاہدین نے دشمن قیدیوں سے کچھ کہے سنے بغیر متعینہ منزل پر پہنچادیا۔

حال ہی میں فرانسیسی وزیر اطلاعات نے میڈیا کے ذریعے کچھ تصاویر کے ذریعے پراپیگنڈا کرنے کی کوشش کی ہے کہ مجاہدین آزادی فرانسیسی فوجیوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانے

نہیں ہچکچاتے۔اس دوران شاید موصوف بھول گئے ہیں کہ فرانسیسی دستوں نے مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کس طرح خاک و خون میں نہلایا اور ہنوز ظلم و بربریت کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہاں میں واضح کر دینا چاہوں گا کہ دشمن کے پراپیگنڈے میں کوئی صداقت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حق و باطل کی اس معرکہ آرائی میں جس حد تک دشمن چلا گیا ہے، ہم کبھی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے لیکن کاروان آزادی کے سفر میں ایسا ممکن نہیں کہ ہمارے دامن پر خون کے دھبے نہ ہوں۔ لہٰذا ہم نہ اس سے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کریں گے نہ ہی ان اس کا انکار کریں گے۔

اگر ہماری یعنی مجاہدین کی یونٹوں سے چھوٹی موٹی لاپرواہی ہو جائے تو دشمن اس کو خوب اچھالتا ہے اور لبریشن فرنٹ قیادت کو ان بے اعتدالیوں کے لئے مورد الزام ٹھہراتا ہے حالانکہ انہیں اس بات کا علم نہیں کہ قیادت کو اتنی بڑی تعداد کو اکٹھا لے کر چلتے وقت کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس دوران قیادت کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے کسی جوان سے کوئی غلطی یا زیادتی نہ ہو جائے۔ وہ اپنے کارکنوں کی تمام کھلی اور چھپی سرگرمیوں سے من وعن واقف ہوتے ہیں۔لیکن اس کے باوجود بھی اگر کوئی ایسا کام ہو جائے جو بظاہر ضابطے کی خلاف ورزی کے زمرے میں آتا ہو تو قیادت کے پاس اسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔مثال کے طور لبریشن فرنٹ کے مقامی ذمہ دار نے اپنے ہی ساتھی کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔تحقیق کرنے پر اس نے موقف اختیار کیا کہ مرنے والے نے پارٹی منشور کے خلاف غداری کا ارتکاب کیا تھا جس وجہ سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔اس دوران قیادت صرف ضمیر کے بل بوتے پر ہی فیصلہ کرسکتی ہے۔ بصورت دیگر اس کے پاس کوئی ایسے شواہد نہیں ہوتے جن کی بنا پر وہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرسکے۔

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کی اس راہ میں جدوجہد کرنے والی اتنی بڑی تعداد کے لئے کسی سخت ضابطہ کی پابندی بہت مشکل ہے، اور پھر ایسی حالت میں جب مقابلہ بھی ایک

استعماری قوت سے ہو جو اپنے مادی وسائل کے حوالہ سے بہت زیادہ منظم ہو۔

اس کے برعکس ہم دشمن کی بربریت اور مظالم کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں جو اس نے نہتے لوگوں کے ساتھ روا رکھے۔ سویڈن صحافی ایک فرانسیسی کیمپ کا جہاں ہزاروں الجزائری باشندوں کو پابند سلاسل کیا گیا ہے کا دورہ کرنے کے بعد اپنے روزنامچے میں لکھی ہے۔

کیمپ کی اگلی قطار میں ایک سات سالہ بچہ بیٹھا ہوا تھا جس کے جسم پر لوہے کی تار سے تشدد کئے جانے کی وجہ سے بیسیوں نشانات تھے۔ فرانسیسی فوجیوں نے اس بستی پر حملے کے دوران اس کی ماں کے ساتھ بدفعلی کی اور ازاں بعد اس کے بھائی اور باپ کو لقمہ اجل بنا دیا۔ کیمپ کے انچارج فرانسیسی کرنل نے بچے کو کئی روز تک سونے نہ دیا تاکہ وہ اپنے اور خود کے اہل خانہ کے ساتھ ہونے والے تشدد کو اپنے حافظے سے فراموش نہ کر سکے۔

یہی اخبار نویس آگے چل کر لکھتی ہے ''میں نے بچے سے پوچھا کہ اس کی آرزو کیا ہے؟'' اس نے بلا جھجک اور بغیر کسی تذبذب کے جواب دیا کہ ''میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے یہ کہ کوئی بدیسی یعنی فرانسیسی فوجی میرے ہاتھ لگے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔''

کیا اب کوئی وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ سات سالہ بچہ آسانی کے ساتھ ان تلخ یادوں کو اپنے دماغ سے بھلا پائے گا۔ ایک طرف سامراج نہتے مقامی لوگوں کے ساتھ بے پناہ مظالم ڈھاتا ہے اور دوسری طرف ان سے جمہوری انداز میں سوچنے کی توقع رکھتا ہے۔

چند سال قبل کون کہہ سکتا تھا کہ فرانسیسی سامراج جگہ جگہ اپنے خونی پنجے گاڑنے کے لئے اتنی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرے گا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ الجزائری باشندے ظلم و جبر کی داستان اپنے خون سے رقم کریں گے اور سامراج کے خلاف شدید مزاحمت کا مظاہرہ کریں گے۔

ہمیں اپنے آپ کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہئے۔ اس وقت سامراج کے ساتھ نبرد

آرمی نسل پرانی نسل سے مختلف ہے۔ نہ اس کے رویے میں لچک، نہ پاؤں میں ثقل۔ یہ بالکل تازہ دم اور جوان جذبوں کے تحت پروان چڑھی ہے۔ یہ اپنے ہزاروں ساتھیوں کے پابند سلاسل ہونے کے بعد چین سے نہیں بیٹھ سکتی۔ یہ آزادی کے حصول کے لئے بے پناہ جذبوں کی مالک، عزم صمیم کی علمبردار، نڈر، بے باک اور بے خوف ہو چکی ہے۔ وقت سے بے خوف، سامراج سے بے خوف، ظلم و تشدد سے بے خوف، استعمار کی کمینگی سے بے خوف، اپنے نفس کی کمزوریوں سے بے خوف۔ ''ہاتھوں میں بندوق اور لبریشن آرمی کا ممبر ہونا ہی ان کے لئے سب سے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ دشمن کے غلبے اور غلامی کی فضا میں زندگی اپنی معنویت کھو چکی ہے۔''

آج کل الجزائر ایک عجیب کشمکش سے دوچار ہے جس سے وہ کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ خود سامراج اس حقیقت کو تسلیم کر چکا ہے لیکن وہ جان بوجھ کر انارکی کی اس فضا کے ذریعے تاریخ کے دھارے کو الٹا چلانا چاہتا ہے جو کہ اس کی خام خیالی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود فرانس کی قومی اسمبلی میں الجزائر کے نمائندوں کے لئے 80 نشستیں مخصوص ہیں۔

لیکن حالات اس دوراہے پر آ گئے ہیں کہ اب یہ سیاسی چالیں اپنی حیثیت کھو بیٹھی ہیں۔ کرہ ارض کے کسی بھی کونہ میں بسنے والا الجزائر کا باشندہ خواہ وہ مرد ہو یا عورت خود سے سوال کرتا ہے کہ اگر ان سیاسی نشستوں کی کوئی اہمیت ہے تو پھر سامراجی ٹولے کا یہاں کیا کام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اب الجزائر کا باشندہ اپنے گلے سے غلامی کا طوق اتار پھینکنے کے درپے ہے۔ وہ اس خونی کھیل کا خاتمہ اور حق و باطل کی ازم آرائی کی کوکھ سے ایک زندہ، آزاد اور خود مختار الجزائر کا متمنی ہے۔

بظاہراً لگتا ہے کہ اس جنگ کی شدت میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ فرانسیسی فوج مزید جارحانہ کارروائیوں کے لئے پر تول رہی ہے۔ حریف قوتوں کے مابین جنگ جاری ہے۔ ہر کوئی اس حقیقت سے آشنائی چاہتا ہے کہ جنگ سب Mobidty کی صورت کیوں اختیار

کر لی ہے۔ ان کے ذہنوں میں ایک اضطراب پایا جاتا ہے جو ان سوالات کے جوابات ہر صورت میں چاہتا ہے۔ زیر نظر صفحات میں میں نے ان سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ آج الجزائر کے مردوں، عورتوں اور جوانوں کو 1930ء کی نسل سے کوئی Resemblance نہیں، نہ ہی یہ 1954ء کی دھائی کے لوگ ہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ یہ 1957ء کے لوگوں سے بھی مختلف ہیں۔ پرانا الجزائر کا عالم پیر مر گیا، وطن عزیز کی سرزمین پر اتنا معصوم خون بہہ گیا جس سے نئی نسل کی آبیاری ہوئی ہے، اور کسی کی نظر سے یہ حقیقت اوجھل نہیں ہونی چاہئے۔ استعمار نے اپنی قوت کے بل بوتے پر اعلان کر دیا ہے کہ وہ الجزائر کی سرزمین پر بسنے والے لاکھوں کروڑوں باشندوں کو "تشدد پسند" مجاہدین کے حوالہ نہیں کرے گا نہ ہی صحرا کے وسائل سے کسی قیمت دستبردار ہوگا۔ لیکن یہ اس کی خام خیالی ہے۔ وہ لوگوں کی اختلافی اور جمالی قوت کو سلب کر کے انہیں اپنے زیر سایہ نہیں کر سکتا۔ وقت بدل چکا ہے۔

زیر مطالعہ قرطاس میں ہم اپنے قارئین پر واضح کریں گے کہ من حیث القوم الجزائری معاشرہ کا اپنا ایک وجود ہے جسے کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ بہت سے ممالک نے سامراجی استبداد سے رہائی کے لئے جو جدوجہد شروع کی اس میں ایک ہی سیاسی جماعت پیش پیش تھی۔ لیکن الجزائر کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں قومی خود آگاہی، غیرت ملی، اجتماعی دکھ درد اور خوف و ہراس نے لوگوں کو یہ بات سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اپنی قسمت اپنے ہاتھوں میں لینے کے علاوہ ان کی بقاء کسی چیز میں نہیں۔

الجزائر ایک خود مختار ملک ہے۔ اس کے باشندے خود کو مقتدر خیال کرتے ہیں۔ صرف فرانس کو اس حقیقت سے آشنائی حاصل کرنا ہے، اور یہ چیز انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرانس اس حقیقت کو کیوں تسلیم نہیں کرتا، وہ نہتے لوگوں کے سر پر تھوپی گئی جنگ سے ہاتھ کیوں نہیں کھینچتا۔ وہ الجزائر کی سیاسی قیادت کے ساتھ مذاکرات سے کیوں فرار اختیار کرتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ایک روشن فکر انسان کو ذہنی طور پر تنگ

کرتے ہیں اور ان کے خاطر خواہ جواب کے لئے وہ مضطرب نظر آتا ہے۔

یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ ہنوز سامراج بہت طاقتور ہے یا یہ کہ صحرائی لوگوں نے خود کو در پیش مسائل کی حقیقت کو مسخ کر دیا ہے۔ اصل میں بات کچھ اور ہے۔ وہ یہ الجزائر میں روشن فکر لوگوں اور خود فرانسیسی حکومت کے لئے راستے کا پتھر یورپی اقلیت ہے۔ الجزائر ایک کالونی ہے جہاں بیرونی یورپی باشندے آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم جنوبی افریقہ ہے۔ یورپی اشرافیہ اس کو کسی صورت ترک نہیں کرے گا کہ وہ فرانس سے اپنے تعلق توڑ لے یا یہ الجزائر کے لوگوں پر جو ظالمانہ قوانین اس نے اپنے مفاد کے حصول کے لئے مسلط کر رکھے ہیں، اُن سے دستبردار ہو جائے۔ حقیقت میں یہ استعمارانہ پالیسی کا ایک تسلسل ہے۔ آج کل فرانسیسی اس پر سختی سے عمل پیرا ہے۔ سیاسی اور عالمی حلقوں میں یہ افواہیں گردش کر رہی ہیں کہ فرانس الجزائر میں قیام امن کا داعی ہے۔ روشن فکر ہونے کے ناطے دور اندیش اور آزاد منش لوگوں کو اس بات پر کان نہ دھرنے چاہئیں۔ اس کی حقیقت ایک پراپیگنڈے کے سوا کچھ نہیں۔

حقیقت یہ کہ اگر فرانس قیام امن کا داعی ہے تو اس کے قیام کے لئے اس کے پاس دو ہی راستے ہیں یا تو وہ بین الاقوامی ادارے اقوام متحدہ کے ذریعے الجزائر پر عالمی عسکری قوت کو مسلط کر دے یا پھر اپنے جاگیردارانہ مفادات کے تحفظ کے لئے الجزائر پر خود قابض رہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو الجزائر کے سیاسی افق پر ہمیں قیام امن نظر نہیں آتا۔ یہ بات نوشتہ دیوار بن چکی ہے کہ فرانس زیادہ دیر تک الجزائر پر اپنا قبضہ قائم نہیں رکھ سکتا خواہ وہ میڈیا اور دیگر ذرائع سے اس بات کی کتنی ہی تشہیر کیوں نہ کرے۔ فرانس حکومت کے سامنے دو راستے ہیں یا تو چند سو جنگی مجرموں کی مخالفت کر کے اپنی ظلم و بربریت سے باز رہنے کا حکم دے اور یا پھر تمام نہتے اور معصوم لوگوں کے قتل عام اور نسل کشی کا حکم دے دے۔

حکومت فرانس انتہائی مضحکہ خیز بیانات دیئے جا رہی ہے کہ "ہمیں 25 ہزار باغیوں کا

سامنا ہے۔" ان کے پاس بھلے ڈھیروں اسلحہ ہو، ان کے کس کام کا۔ کیونکہ فرانس کے بقول
باغی چند ہزار نفوس پر مشتمل ہیں۔ اگر اس کی بات مان لی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ
سامراج اس قدر خائف کیوں ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ فرانسیسی استعمار کے
مظالم کے ہاتھوں پورا ملک جہنم بنا ہوا ہے جہاں ہر مرد وعورت لبریشن فرنٹ کی قیادت سے
اس لئے نالاں ہے کہ ان کے ہاتھ میں بندوق کیوں نہیں تھما دی جاتی۔ اگر یہ لاکھوں مردان
صدق وصفا حکومت الجزائر کی پشت پر نہ ہوتی تو حکومت کی کیا قدر واہمیت رہتی۔

فرانسیسی حکام نے حال ہی میں تسلیم کیا ہے کہ تقریباً 10 لاکھ بے خانماں لوگ از سر نو
منظم ہو رہے ہیں۔ وہ ان ہتھکنڈوں کے ذریعے ملکی فوج کو اپنے لوگوں سے جدا کرنا چاہتے
ہیں تاکہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو سکیں۔ لیکن حالات بدل چکے ہیں۔

فرانسیسی استعمار کی جیلوں میں پابند سلاسل لاکھوں لوگوں کو پہلے ذلیل ورسوا کیا گیا
لیکن سامراج کو اس پر صبر نہ آیا لہٰذا اس سے بڑھ کر انہوں نے ان نہتے لوگوں کو نفسیاتی طور
پر اذیتیں دینا شروع کر دیں تاکہ ان کے اعصابی نظام میں خلل ڈال کر ان کی قوت مدافعت
اور قوتِ ارادی کو تباہ کیا جاسکے۔ یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ سامراج کی لڑائی کا
مقصد مقامی لوگوں پر حکومت اور ان کے وسائل پر اپنا ناجائز تسلط قائم رکھنے کے علاوہ کچھ
نہیں۔ یہ الجزائر میں اپنا بھرم (Image) قائم رکھتا ہے جو اس نے برتر ہونے کا ڈھونگ رچا
کر قائم کر رکھا ہے اور اس سے بڑھ کر مقامی لوگوں کو اپنی سرزمین اور ثقافت سے توڑنا چاہتا
ہے جو انہوں نے صدیوں کی جہدِ مسلسل کے ذریعے اختیار کر رکھی ہے۔ لیکن سامراج کا یہ
خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

الجزائری قوم کی منزل زیادہ دور نہیں۔ وہ محض تخیل کی بھول میں کھونے والی نہیں۔
اس کی کوکھ سے ایک زندہ انسان نے جنم لیا ہے جو اپنے فکر وعمل کے حوالے سے بالکل انوکھا
ہے۔ جسے اپنے وجود (Existence) کی تشکیل نو کرنا ہے۔ یہ مفروضہ نئی نسل نے سچ کر

دکھایا کہ جب انسان اپنے نفس میں انقلاب برپا کرتے ہیں تب وہ بیرونی دنیا میں تبدیلی
کے درپے ہوتے ہیں۔ اور یہ عنصر الجزائر کی تاریخ میں اس سے قبل کبھی اتنا واضح نہیں ہوا جتنا
کہ آج اس کے افق پر نظر آ رہا ہے۔ طاقت کا امتحان نہ صرف انسان کے شعور کی تشکیل نو
کرتا ہے بلکہ اس کے اردگرد کے ماحول حتیٰ کہ اس پر مسلط ظالم حاکموں تک کو اکھاڑ پھینکتا
ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ جدوجہد مختلف منازل پر نئے نئے روپ دھارتی رہتی ہے کبھی
خواب، کبھی خیال، کبھی وجدان، کبھی یقین اور بالآخر منزل۔

آج ہمیں الجزائر کے انسان میں وہی روح نظر آ رہی ہے جو تعمیر وترقی کی شاہراہ پر
چلنے کے لئے بیتاب ہے۔ کس کی جرات ہے کہ اس تحریک کو روک سکے۔ اس مرحلے پر ہمیں
چاہیے کہ اس تحریک کی شان وشوکت اور وجاہت وجلال کو کھلی آنکھوں سے دیکھیں بلکہ جن
جن مراحل سے یہ ارتقائی حوالہ سے گذر رہی ہے اس کا بھی بغور مشاہدہ کریں۔ کیا ہم اب
بھی ایسے وقت میں رہ رہے ہیں جہاں ایک شخص کو ریاست کا شہری بننے کے لئے لڑنا اور مرنا
پڑے گا۔ کیا "فرانسیسی مسلمان" سے زیادہ کوئی اور اصطلاح ہتک آمیز، ذلت آمیز، بیہودہ
اور پریشان کن ہو سکتی ہے۔ اور وہ افتادگی، بربریت، ہتک، اور ذلت مجھے زندہ رکھنے کے
لئے سامراج محکوم لوگوں پر مسلط رکھنے کے لئے ہر صبح اس کی آبیاری کرتا ہے۔ کیا یہ جواز
خطرناک سے خطرناک جرم کے ارتکاب کے لئے کافی نہیں؟ فرانسیسی جنرل شالے کا دعویٰ
ہے بغاوت پر فتح کے امکان کو ختم نہیں کیا جاسکتا یعنی بغاوت کو کسی صورت سر نہیں اٹھانے دیا
جاسکتا۔ نوآبادیاتی جنگوں کے تمام فوجی جنرل اس طرح کی ہرزہ سرائی کرتے رہے ہیں۔
لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے مختلف علاقوں میں آزادی کی تحریکوں کو کچلنے
میں ناکامی سے ہمکنار ہوئے اور اب الجزائر میں اس کا کیا امکان ہے کہ وہ اس "بغاوت"
کو دبانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہاں ہم اپنے استدلال کے حق میں کیمرون کی
مثال پیش کریں گے۔ کیا سامراجیوں نے UPC یعنی یونین آف کیمرون پاپولیشن کا

دبانے میں کوئی کسر چھوڑی لیکن تاریخ گواہ ہے کہ کیا اہل کیمرون آزادی حاصل کر کے رہے۔ زیر مطالعہ قرطاس میں ہم اسی حقیقت کو آشکار کریں گے نو آبادیاتی نظام الجزائر میں اپنی حیثیت کھو چکا ہے جبکہ الجزائر فتح ونصرت سے سرفراز ہو چکا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اسے اپنے مقصد کے حصول کی بہت بڑی قیمت چکانی پڑی۔ وہ لوگ جو تاریخ میں کھو گئے تھے انہوں نے اپنے ہاتھ میں قومی پرچم تھام کر اپنی حقیقت کو پالیا ہے۔ وہ لوگ جنہیں جاہل وگنوار ہونے کا طعنہ دیا جاتا تھا انہوں نے اپنے حسنِ عمل سے ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ جدوجہد کی تاریخ، مزاحمت کی تاریخ، یقین کی تاریخ، آزادی کی تاریخ، تعمیر وترقی کی تاریخ، انسانی عظمت کی تاریخ۔ اب انہیں گنوار اور پس ماندہ نہیں رکھا جاسکتا، نہ وہ ظلم پر خاموش رہ سکتے ہیں۔

فرانسیسی استعمار کو یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہئے کہ الجزائری حکومت کسی بھی مقامی باشندے کو کسی وقت بھی حرکت میں لاسکتی ہے۔ یہاں تک کہ لبریشن فرنٹ کے کہنے پر گذشتہ دنوں انتخابات میں کامیاب امیدواروں نے استعفےٰ دے دیئے۔ فوج کسی بھی وقت اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کو دوبارہ فتح کر سکتی ہے لیکن لوگوں کے ذہنوں میں احساس کمتری، خوف وہراس، ناامیدی ویاس کیسے پیدا کر سکتی ہے جو ماضی میں کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب وقت بدل چکا ہے۔ لوگوں کے لئے اس طرح کی باتیں بے معنی ہو گئی ہیں۔

استعمار نے حقیقت سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اس کا گمان ہے کہ ان کی قوت کا انحصار مشین گنوں اور جدید اسلحے پر ہے۔ یہ بات پچاس کی دھائی میں تو کسی حد تک درست تھی لیکن آج کے حالات پر صادق نہیں آئی۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ بعض عناصر تاریخ کے پیمانے میں اپنا وزن رکھتے ہیں۔ لیکن اب یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ مشین گنیں، توپیں اور دیگر ہتھیار صرف سامراج کی ملکیت نہیں رہے۔ دنیا کی دوتہائی آبادی ہمیں حسب ضرورت ہتھیار فراہم کرنے کے لئے تیار ہے اور باقی ماندہ ایک تہائی جو

ہتھیاروں پر آمادہ نہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ انقلاب کے مخالف ہیں۔ بالکل نہیں! بلکہ وہ کسی دیگر طریقے سے تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ لیکن یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ ان کی اخلاقی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہیں۔

فرانسیسی جنرل ڈیگال نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہا کہ "باپ کا الجزائر مر چکا ہے" جنرل صاحب کی اس بات میں آدھا سچ ہے، پورا نہیں۔ بڑے بھائی کا الجزائر بھی مر چکا ہے۔ اب یہ نیا الجزائر ہے۔ الجزائری قوم کا ملک ان کا اپنا ملک، اپنی حکومت، اپنا اقتدار ___ ان تلخ حقائق کو جلد یا بدیر تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

آئندہ ابواب میں ہم اپنے قارئین کو اس تبدیلی سے روشناس کرانا چاہتے ہیں جو الجزائر کے لوگوں کے شعور میں پیدا ہوئی۔ انقلاب کے بعد کیا ایک تشدد کی جگہ دوسرے تشدد کو متعارف کروایا جائے گا؟ نہیں بالکل ایسا نہیں۔ ہم نو آبادیاتی باشندے (Colonizer) کے پیچھے چھپے انسان کو دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ انسان جو بیک وقت منظم بھی ہے اور ظالمانہ نظام کا شکار جس نے اس کے لبوں پر مہر خاموش ثبت کر دی ہے۔ ہم ایک آزاد الجزائر کے خواہاں ہیں جو ہر طرح کے صاحب ذوق کو جنم دے۔ جس گود میں حسن وعشق، علم واستدلال، جرات واستقلال، صاحب فن کسان پروان چڑھیں۔ یہ وہ چیز ہے جس کی ہم نے خواہش کی تھی اور یہی وہ چیز ہے جس کے لئے ہم اپنی تمام تر توانائیاں صرف کریں گے۔ ہمارا اس بات پر ہرگز یقین نہیں اس کاروان دعوت وعزیمت میں کوئی چیز ہمارے پاؤں کی بیڑی بنے۔

فینن

جولائی 1959ء

باب اوّل

دریدہ دامن الجزائر

کسی معاشرے میں لوگوں کے مقامی لباس اور روایتی طرز زندگی سے لوگوں کی انفرادیت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ لوگ کس انداز سے رہتے اور کس نقطہء نظر سے سوچتے ہیں۔ لباس میں یہ تبدیلی وقت کے ساتھ ساتھ آتی رہی ہے جو ان کی تہذیب کو واضح کرتی ہے۔ لیکن اس طرز لباس کا کلی طور پر جائزہ لیں تو اس کا تاثر ایک جیسا ہی ہوتا ہے اور لباس ہی کی بنیاد پر مرد و خواتین کے ایک گروپ کو ایک ہی بندھن میں باندھا جا سکتا ہے جو کسی بھی بڑی سے بڑی تہذیب کی بنیاد ہوتا ہے۔

یہ عام بات ہے کہ سب سے پہلے معاشرے کی طرز Types آشکار ہوتی ہے خواہ یہ کسی تحریری بیان سے، تصویروں کے ریکارڈ سے یا جذباتی قسم کی تصویروں سے۔ اسی طرح دنیا میں ایسی تہذیبیں بھی ہیں جن کا لباس شیر کی کھال کے لباس سے مختلف ہوتا ہے جس میں ہیٹ کا استعمال ضروری نہیں ہوتا لہٰذا کسی بھی ثقافتی گروپ سے تعلق ظاہر کرنے کے لیے مخصوص لباس ضروری ہے۔ مثال کے طور پر کوئی سیاح اگر مسلم معاشرے میں آئے تو وہ اس بات کو فوری طور پر نہیں سمجھ سکتا کہ مسلمان خنزیر کا گوشت نہیں کھاتے یا یہ کہ ماہ رمضان میں مسلمان اپنی بیویوں سے روزانہ جذباتی تعلقات قائم کرنے سے پرہیز کرتے ہیں وغیرہ

وغیرہ۔لیکن مستورات کو پردے میں دیکھ کر اس پر یہ بات فوری طور پر واضح ہو جائے گی کہ یہ ان کا روایتی اور ثقافتی لباس ہے۔اور یہ کہ ان خواتین کا عربی تہذیب سے تعلق ہے۔

اسی طرح افریقہ کے مسلم ممالک تیونس، الجزائر، مراکش اور لیبیا میں پردہ لینا روایتی طور پر ضروری ہے۔اگر ان ممالک میں کوئی غیر ملکی یا سیاح آئے تو اس کے لیے مقامی خواتین کو دیگر عورتوں سے جدا کرنا قدرے مشکل نہیں بلکہ پردہ ان کے درمیان واضح فرق کرنے کے لیے کافی تصور کیا جائے گا۔جہاں تک مردوں میں فرق کرنے کا تعلق ہے تو ان کی علاقائی قد وقامت کے حوالہ سے اس کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔مثال کے طور پر دیہات میں رہنے والے سخت جان اور محنت کش لوگوں کو شہروں کی آرام طلب آبادی سے بآسانی جدا کیا جا سکتا ہے لیکن عورتوں کی پہچان کرتے وقت اس قدر نفسیاتی الجھنوں کا شکار نہیں ہونا پڑتا بلکہ پہلی اور سادہ نظر سے اس بات کا ادراک ہو جاتا ہے کہ جو خاتون بڑی چادر یا روایتی برقع میں ملبوس ہے اس کا تعلق مسلم معاشرے سے ہے۔لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ مسلم مستورات کی اولین اور واضح نشانی ان کا پردہ ہے۔آپ کو سن کر حیرانی ہوگی کہ ایک چھوٹی بچی بھی اس روایتی پابندی سے ماورا نہیں بلکہ وہ بھی اسی شوق سے پردہ لیتی ہے جس شوق سے بچی کی ماں یا خاندان کی کوئی بڑی خاتون لیتی ہے۔لہٰذا کسی اجنبی کے لیے الجزائر کی عورت کو پہچاننا ذرا مشکل نہیں۔اسے تذبذب کا شکار ہونا پڑتا ہے بلکہ اگر آپ کسی عورت کو پردے کی حالت میں دیکھیں لامحالہ فوری طور پر کہہ دیں کہ یہ الجزائر نژاد خاتون ہے۔

جب استعمار الجزائر میں آیا تو یہ معاشرتی اور روایتی پہچان اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی جسے کہ اس نے ہر قیمت پر دور کرنے کی ٹھانی اور اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس نے ہر طرح کے ذرائع استعمال کیے۔اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو فیصلہ کن جنگ 1954ء کے بجائے 1936ء میں ہی شروع ہو گئی تھی جب

استعمار پسندوں نے الجزائریوں کے ساتھ اپنے تہذیبی فرق کو مٹانے کے لیے ماہرین عمرانیات کو میدان کارزار میں اُتارا تاکہ مشرقی اور مغربی عورت کے درمیان فرق ختم کیا جا سکے جس کی سب سے بڑی علامت پردہ تھا۔ان ماہرین عمرانیات کے علاوہ استعمار پسندوں نے عرب بیورو کے نام نہاد دانشوروں کو بھی اپنے ساتھ ملایا جنہوں نے اس معرکے کو سر کرنے کے لیے پہلا فارمولا یہ دیا کہ "اگر تم مسلم معاشرے پر غلبے کے خواہاں ہو تو سب سے پہلے عورت پر قبضہ حاصل کرو باقی سب کچھ اس کے ساتھ تمہیں مل جائے گا کیونکہ ان کے مطابق مسلم معاشرے کی ہر چیز عورت کے دامن سے جڑی ہوئی ہے لہٰذا اسی مفروضے کی بنا پر انہوں نے یہ شیطانی حکمت عملی تیار کی۔

اسی طرح الجزائر کے پدرنسلی معاشرے میں مغربی دانشوروں نے یہ بات پھیلائی کہ عرب معاشرہ بنیادی طور پر ایک مادری معاشرہ ہے جس میں عورت کو ہی مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔اور وہ واضح اور غیر واضح یعنی نہ نظر آنے والی قوتوں کے درمیان ایک بہترین کڑی ہے۔اس حیثیت میں عورت ایک ماں بھی ہو سکتی ہے اور، بہن، بیٹی اور بیوی وغیرہ بھی۔لہٰذا استعمار نے معاشرے کی قدروں پر حملہ آور ہونے کے لیے سب سے پہلے عورت کو نشانہ بنایا۔اس نے سوچا کہ افریقہ پر قبضہ کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ عورت کو ورغلا کر اس کے مقام سے گرا دیا جائے اس طرح ان کا پورا نظام بگاڑ کا شکار ہو کر اپنی وحدت اور اصلیت کھو بیٹھے گا۔اس مشن کی خاطر انہوں نے اپنا سیاسی عقیدہ بنا لیا کہ اگر ہم الجزائری معاشرے کو تباہ کر کے اس کی قوت مزاحمت ختم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے عورت پر فتح حاصل کرنا ہوگی۔انہوں نے سوچا کہ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے عورت کے پردے کا جائزہ لینا ہوگا اور اس گھر کی نوعیت اور ہیئت دیکھنا ہوگی جہاں مرد نے اسے تمام دنیا سے اوجھل رکھا ہے اور خود کارزار حیات کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا ہے۔

جب استعماری نظام نے عورت کو نشانہ بنا کر اپنے مقصد کی تکمیل کا آغاز کیا تو الجزائر کا باشندہ ایک مضبوط حصار کی صورت میں آڑے آ گیا۔ اس نے عورت کو شمع محفل بننے کے راستے میں رکاوٹ ڈالی۔ مغربی لوگوں نے عورت کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے انہیں مردوں کے خلاف بھڑکا دیا اور جھوٹا پراپیگنڈہ کیا کہ مرد خواتین کو پسماندہ، جاہل اور گنوار رکھنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس بات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مزید برآں الجزائری باشندے کے افکار و اعمال بھی جھوٹے پراپیگنڈے سے نہ بچ سکے۔ بلکہ ان پر دیہاتی، گنوار اور ظالم و بربر جیسے القابات ٹھونسے گئے۔ اسی طرح استعمار کے علمبرداروں نے پہلا حملہ الجزائر میں خاندان پر کیا اور اسے بگاڑ کر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تمام حربے، طریقے اکٹھے کیے اور میدان کارزار میں کود پڑے۔

اس طرح عورتوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کے لیے ایک نظام بنایا گیا، امدادِ باہمی کی نئی نئی انجمنیں بنائیں گئیں، ترقیاتی ادارے کھولے گئے اور عورتوں کو باور کرانے کی کوشش کی کہ جس طرح مقامی مردان کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرتے ہیں وہ بہت ہی قابل افسوس ہے۔ سب سے پہلے خواتین کو دھوکا دینے کے لیے جو اقدام کیا گیا وہ یہی تھا کہ عورتوں کو امدادِ باہمی اور دیگر فلاحی اداروں میں خیراتی کاموں پر لگایا گیا کہ وہ عرب خاندان کے گھروں تک رسائی حاصل کر کے ان سے رابطہ کریں اور انہیں اپنے پروگرام کی فیوض و برکات سے آگاہ کریں۔

آزاد خیال اور آوارہ عورتوں نے سب سے پہلے مغرب نواز ایجنٹوں کے ہاتھ پر لبیک کہی۔ اس طرح وہ چند کلوگرام چینی کے عوض اپنا پردہ اتارنے کے لیے تیار ہو گئیں۔ انہوں نے کانچ کی چوڑیوں کے عوض اپنی عصمت کے نگینے فروخت کر دیے۔ عورتوں سے کہا گیا کہ اب اس سے آگے بڑھ کر مزید اقدامات کریں۔ مختلف پروگراموں میں عورتوں کو بلایا گیا تا کہ انہیں اس بات پر آمادہ کیا جا سکے کہ اب وہ صدیوں پرانے طرز زندگی پر

نہیں رہ سکتی۔ وہ اپنی زندگی میں تبدیلی کی خواہاں ہیں۔ فرانسیسی اس بات سے پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے کہ جب تک عورت پر قبضہ نہیں پا لیا جاتا ان کے خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتے۔ استعماریوں نے اس تحریک خبیثہ پر کروڑوں خرچ کیے۔ جب ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ الجزائر کے معاشرے میں عورت بنیادی حیثیت کی حامل ہے تو اس پر مزید ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ مزید برآں استعماری اس بات سے بخوبی واقف تھے اگر الجزائر کی حقیقت مسخ کرنے کے لیے ان کی ثقافت پر حملہ کیا گیا تو مرد اس کو کسی صورت قبول نہیں کریں گے۔ انہیں پتہ تھا کہ ان کے نظام کا تمام تر حسن عورت کی ذات سے وابستہ ہے جب تک خود عورت الٹی گنگا نہ بہنا شروع کر دے اس وقت نظام کو ہلایا اور بگاڑا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا نو آبادیاتی نظام کے پروگرام کے مطابق معاشرتی نظام کی جڑیں کھوکھلی کرنے اور مردوں کا مطمع نظر تبدیل کرنے کا مشن عورت کو سونپا گیا۔ عورت کا ذہن تبدیل کرنا، اس پر خارجی اقدار کا غلبہ قائم کرنا اور اسے اس کے مقام سے گرانا ایسے محرکات تھے کہ ان کی مدد سے بیک وقت دوہرے فوائد حاصل کیے جا سکتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک تیر سے دو شکار کرنے والی بات تھی۔ ایک طرف اس فارمولے سے خود عورت بے نقاب ہونا تھی اور دوسرا اس نے مرد کو اپنے شکنجے میں لے کر ثقافت کی تباہی کا بیڑا اٹھانا تھا۔

گرچہ اس مضموم اور ننگ انسانیت کام کا آغاز استعماریوں نے ملک میں آتے ہی کر دیا تھا لیکن ان کے دل کی بات ہے کہ تمام کوششوں کے باوجود انہیں اس مقصد میں کامیابی نہیں مل سکی۔

ایک دفتر میں کام کرنے والے مقامی شخص کو ہمیشہ اپنے ساتھیوں اور افسروں کی طرف سے اس طرح کے طعنے سننا پڑتے ہیں ‘‘کیا تمہاری بیوی ہے’’ اگر ہے تو کیا وہ پردہ لیتی ہے اور یہ کہ تم اسے ہوٹل، کیفے یا سینما کیوں نہیں لے جاتے؟ ان کی خباثتوں کا سلسلہ صرف

یہیں نہیں رک جاتا بلکہ وہ تمام قومی اور مذہبی تہواروں مثلاً کرسمس ڈے یا کسی اور نمائش کے وقت طرح طرح کے حیلے بہانے استعمال کر کے مقامی آدمی کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کرتے اکثر اسے کہا جاتا ہے کہ فلاں تاریخ کو ہمارے ہاں بہت بڑی تقریب ہو رہی ہے جس میں بڑے بڑے لوگوں کو بلانے کا اہتمام کیا گیا ہے اور آپ کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے کہ آپ اپنی اہلیہ کے ساتھ اس میں شرکت کریں۔ یہاں مقامی ملازم کے لیے کڑا امتحان ہے تقریب میں آنے کے بعد وہ میاں بیوی اکٹھے نہیں رہیں گے بلکہ انہیں علیحدہ علیحدہ جگہوں پر رہنا پڑے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس دن ڈائریکٹری یا محکمے کا سربراہ اس کی ڈیوٹی کسی دوسری جگہ لگا کر اسے بری طرح مصروف کردے۔ یہاں مقامی شخص ایک نئے امتحان سے دوچار ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے سربراہ (Boss) یعنی افسر کی بات مانتا ہے تو اس میں اس کی ہار ہے۔ یعنی اس طرح وہ خود ہی اپنی بیوی کی عزت نیلام کرنے پر رضامند ہو گیا۔ اور اگر وہ بیوی کو تقریب میں ساتھ لے کر نہیں جاتا تو اس سے وہ اپنے مالک کو مطمئن نہیں کر سکتا، ہو سکتا ہے کہ اس کشمکش میں وہ اپنی ملازمت سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہاں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جس میں مقامی شخص نفسیاتی کرب میں مبتلا ہے کہ ایک طرف اس کی عزت و عصمت ہے اور دوسری جانب معاشی تنگدستی کا ڈر۔ نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن۔

ان حالات میں ایک مقامی دانشور کا رویہ ذہنی طور پر بہت تند ہو جاتا ہے اور حاکم اس غلامانہ اور باغیانہ صورت حال کو نہ صرف اچھی طرح دیکھتا ہے بلکہ اس میں بار بار مداخلت کی بھی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس مقامی ڈاکٹروں اور وکلاء کا رویہ قدرے بے کیفی پر مشتمل ہوتا ہے یعنی وہ استعمار کے خلاف کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ دانشور جو اپنی بیویوں کو ڈاکٹروں اور دیگر صاحب ثروت لوگوں کے مقابلے میں نصف غلامانہ زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو لوگوں کے طعن و تشنیع سے آزاد نہیں رکھ سکتے بلکہ جب بھی لوگوں کو موقع ملتا ہے وہ انہیں اپنی شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ نو آبادیاتی

نظام عورت کی اس صورت حال پر مقامی اخلاق و اطوار کو شدت کے ساتھ کوستا ہے۔ استعمارانہ ثقافت کے حامل آزاد خیال لوگ عورت کے ساتھ اس طرح کی بے وفائی اور کج ادائی پر بہت کڑھتے ہیں اور عورت کو مظلوم اور بے کس قرار دے کر اس کے معاملے میں دلچسپی لینا شروع کردیتے ہیں۔

ان حالات میں ایک استعمارانہ ثقافت کے نمائندے دانشور کو اپنے تند و تیز طعنوں کا نشانہ بنانے پر پوری طرح آمادہ نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ کہتے ہیں کہ ''مقامی'' شہری ایک ڈاکٹر تو بن گیا ہے لیکن وہ ہے اجڈ اور گنوار ہی۔ کبھی ہرزہ سرائی کرتے ہیں کہ خواہ انسان خاک سے اوج ثریا تک پہنچ جائے اس کی فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس طرح کی متعصبانہ ''دلبریاں'' بڑھتی رہتی ہیں۔ اور مزید یہ کہ مغربی لوگ ایک مقامی دانشور پر اس کی سیاسی سرگرمیوں اور تبدیلیوں کے لیے کی گئی کوششوں کو موردالزام نہیں ٹھہراتے بلکہ یہاں بھی ان کا ہدف ''عورت'' ہی ہوتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ نام نہاد ہمدردی کا جذبہ جتاتے ہیں اور دانشور کو اس کے بے کیف اور کم آمیز رویے کی بنا پر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ وہ اپنی اہلیہ کو ان سہولتوں اور آسائشوں سے ہمکنار کرنے میں بخل سے کیوں کام لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغربی اپنی معاشرتی اقدار اور روایات کو مکمل اور آئیڈیل تصور کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اس کو مقامی لوگوں پر منطبق بلکہ ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں استعماریوں کو اکثر یہ کہتے سنا گیا ہے کہ ہم یہاں بیس برس سے آباد ہیں لیکن فلاں شخص کی بیوی کو آج تک نہیں دیکھا۔ پھر استعمار نواز طبقہ صرف یہیں پر قناعت نہیں کرتا بلکہ معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر کے کہتا ہے کہ ہماری تو تمام محنت بے کار میں گئی، مسلمان تو اب بھی خواتین کو اپنے تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔

استعمار نواز طبقہ ایک خاتون کو اس طرح مظلوم بنا کر پیش کرتا ہے کہ شاید عورت ہی

مقامی معاشرے میں سب سے پسی ہوئی مخلوق ہے۔ لیکن مقامی لوگ اپنی ثقافت اور روایات کے اسلحے سے لیس ہوکر میدان میں اترتے ہیں۔

مقامی لوگوں نے اپنے فاتحین اور نوآبادیات قائم کرنے والوں کا نظام کس طریقے سے رد کیا اس کی اپنی داستان ہے۔ گذشتہ 20 برسوں کے دانشورانہ ادب (Litrature) کے مطالعے سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔ یہاں اب اس کام کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ اس وقت ہم صرف اتنا اشارہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ پسماندہ ممالک میں بڑے بڑے دانشوروں اور ماہرین تعلیم ونفسیات نے ان لوگوں کے اس قدر پسماندہ رہنے کی تمام وجوہات کا بخوبی اندازہ لگایا ہے کہ استعمار نے مقامی لوگوں پر اپنی روایات، اقدار ٹھونسنے کے لیے کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کیے اور مقامی لوگوں نے جواب میں اس کے خلاف کس چیز کو ڈھال بنا کر اپنی اقدار کو بچایا۔ قوم خواہ خود مختار ہو یا پسماندہ، اس کی تہذیبی اقدار پر پورے طور پر یا اس کے کسی ایک جزو پر حملہ آور ہونا کوئی آسان کام نہیں اور اگر کوئی اس کام کو سرانجام دینے کی کوشش کرے تو خود وہ کام بھی اس مدافعت اور مزاحمت کی بھینٹ چڑھ جائے گا جو مقامی لوگوں اور دانشوروں کے ذریعے کی جاتی ہے۔

جہاں تک ایک ثقافت کا کسی دوسری ثقافت پر اثر انداز ہونے یا مقامی ثقافت کو مغلوب کرنے کا سوال ہے تو یہ اس ثقافت کے اخلاق واطوار اور دیگر اقدار کو سمجھے بغیر بالکل ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی تہذیب کے بعض ستون انتہائی طاقت ور ہوتے ہیں جن کے سہارے وہ کھڑی ہوتی ہے، انہیں اس قدر آسانی کے ساتھ ہلایا نہیں جاسکتا۔ جب کہ استعمار نواز حلقوں کو مبالغہ آرائی کی حد تک اپنی کامیابی کی توقع ہوتی ہے۔ جہاں تک کسی بیرونی ثقافت کا مقامی ثقافت پر حملہ آور ہونے کا تعلق ہے تو اس بارے رومانوی نظریات رکھنا ویسے ہی ایک خام خیالی ہے۔ اگر ہم حقائق کا جائزہ لیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ استعماریوں کو مستورات اور دختران ملت کے پردے کے حوالے سے بعض کامیابیاں بھی

ملیں اور بعض خواتین کو اپنے شکنجے میں لینے میں کامیاب بھی ہوئے، لیکن محض دھوکے کی بنیاد پر، لیکن دھوکا کتنی دیر تک چل سکتا ہے۔ مغرب نواز لوگوں نے مقامی عورت کو یہ باور کرایا کہ پردے میں رہنے کی وجہ سے اس پر ہر وقت جو خوف سوار رہتا ہے وہ پردہ اتارنے کی صورت میں جاتا رہے گا اور اس طرح وہ اپنے آپ کو زیادہ محفوظ و مامون تصور کرے گی۔ یورپی لوگ اپنی اس نام نہاد کامیابی پر بہت اترائے۔ انہیں کسی حد تک کامیابی بھی ملی۔ چند مقامی خواتین نے اپنے آپ کو اس امتحان کے لیے پیش کیا۔ اب وہ کھلے چہرے، مغربی طرز کے کپڑے پہنے بازاروں میں برسرعام نظر آنے لگیں۔ لوگوں نے انہیں شمع محفل سمجھ کر ان سے اپنی آنکھوں کی ہوس بجھائی اور مغربی تہذیب کے علمبردار اپنی کوششوں کی بارآوری پر خوش ہوئے کہ وہ چند مقامی خواتین کو اپنی تہذیبی یلغار کی بھینٹ چڑھانے میں کامیاب ہو گئے۔

ملکی انتظامیہ نے اس کامیابی کو غنیمت جانا اور اگلے مرحلے کی تیاری شروع کر دی کہ عورت کو انتظامی امور اور دیگر سرگرمیوں میں الجھایا جائے تاکہ اسے مزید آلۂ کار بنا کر معاشرتی بگاڑ کا ''مشن'' تیزی سے مکمل کیا جا سکے۔

مغربی استعمار کے اس نظریے کو تقویت ملی کہ اب مقامی عورت معاشرے میں ہماری مداخلت کے عمل کو یقینی بنانے میں آسانی پیدا کرے گی۔ ہر وہ عورت جو بے نقاب ہوئی اور جس نے اپنا پردہ اُتارا وہ مغربی استعمار کی منظور نظر بن گئی۔ عورت نے مغرب والوں کو اپنی حیثیت اور اوقات کے بارے میں ایک ایک خبر سے آگاہ کر دیا۔ اس کی کمزوریاں نمایاں ہوگئیں اور اس نے اپنے آپ کو مغرب کے سامنے بالکل بے نقاب کرلیا۔ سامراج کو صرف اس پر صبر نہ آیا۔ ہر لمحے اس کی ہوس بڑھتی گئی۔ وہ ہر گھڑی اس بات کا خواہاں ہوتا کہ کوئی نیا مقامی چہرہ اس کے سامنے آئے۔ عورت نے خود اپنی خاموش زبان سے واضح کر دیا کہ نوآبادیاتی نظام کے علمبرداروں کے لیے اس کا چہرہ حاضر ہے، وہ اسے جس طرح چاہے استعمال کرسکتا ہے۔ ہر پردہ جو چہرے سے ہٹا، ہر وہ ذات جس نے مقامی روایات سے

اپنے آپ کو آزاد کرلیا اور ہر وہ چہرہ جس نے فاتحین کی ہوس بھری نظروں کا نشانہ بننا پسند کر
لیا، اس منفی حقیقت کا اعتراف تھا کہ الجزائر نے اپنی حقیقت کو بھلانے کے عمل کی ابتدا کر دی
ہے اور وہ اب استعمار نواز لوگوں کے ہاتھوں کھلونا بننے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اب
اسے اپنی عصمت کا نگین فروخت کرنے کا کوئی ملال نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الجزائری
معاشرے نے بیرونی آقاؤں کے حکم پر اپنے ہاں تبدیلی کی ٹھان لی اور اپنی روایات،
قدامت پسند مگر صحتمندانہ اقدار کو بوجھ سمجھ کر اتارنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

اس منظر کے بعد ہمارے لیے یہ بات کوئی پراسرار شے نہیں رہ گئی کہ کس طرح ایک
نو آبادی میں انتظامیہ اور اس کے دیگر کارندوں نے عورت کو بے نقاب کرنے کے لیے کون
کون سی تدابیر اختیار کیں اور اس کے برعکس مقامی معاشرے نے اپنی ثقافت کو بچانے کے
لیے کیا کیا تدابیر اختیار کیں۔ انفرادی سطح پر یہ جاننا بہت دلچسپ ہوگا۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ یورپی باشندے جنہوں نے لوگوں کی ثقافتی
اقدار تبدیل کرنے میں براہ راست حصہ نہ لیا، ان کا اس منظر نامے میں کیا ردعمل تھا؟۔
نفسیاتی حوالے سے چند پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ پردہ عورت کے حسن اور اس کی
زینت کو چھپاتا ہے اور اس صورت میں کسی عورت کو جب کوئی شخص دیکھتا ہے تو اس پر
جنسیاتی غلبہ ہوتا ہے۔ اس چیز کا اندازہ ہم یورپی سیاح کے مشاہدے سے لگا سکتے ہیں جو پہلی
مرتبہ الجزائر آیا اور اس نے چند بے پردہ خواتین کو دیکھا اور پھر اس تجربے کو لفظوں کا روپ
دے دیا۔ پیشے کے حوالے سے وہ شخص ایک وکیل تھا وہ اپنے سفرنامے میں کہتا ہے کہ
الجزائری ان خواتین کے حسن کو چھپا کر بہت بڑے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس کے
علاوہ اس نے اپنی سفارشات میں واضح طور پر لکھا کہ یا تو کوئی ایسا نظام بنایا جائے کہ جس
میں خواتین کے لیے انعام و اکرام رکھے جائیں جن سے متاثر ہو کر وہ اپنے آپ کو ہمارے
حوالے کر دیں یا پھر ایسا جابرانہ نظام قائم کیا جائے وہ وہاں آنے کے لیے مجبور ہو جائیں اور

ان کے پاس فرار اختیار کرنے کا موقع نہ رہے۔

ریل گاڑیوں، پارکوں، عوامی جگہوں پر گھومنے والے یورپی باشندوں کے لیے مقامی
عورت کی سیاہ زلفوں، کشادہ ماتھے اور سڈول جسم کی ہلکی سی نمائش ہی کافی تھی۔ یورپیوں نے
الجزائری عورت کو ملکہ حسن کا خطاب دیا۔ مغرب نے اپنی دیگر روایات کی طرح اس مقام پر
بھی دوہرے معیار سے کام لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی فطرت میں منافقت کا عنصر پایا
جاتا ہے۔ اس کی فطرت میں ایک دوغلا پن نظر آتا ہے وہ عورت جو اس کی نظر میں سراپا حسن
وناز ہے اسی عورت کے سامنے وہ الجزائر کے مردوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتا ہے۔ عورت کو بے
نقاب کرنا اس کے حسن کو بے نقاب کرنا ہے، اس کے راز فاش کرنا ہے اور اپنے مضموم
مقاصد کی تکمیل کے لیے اسے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ اس کے برعکس عورت کا
اپنے چہرے کو چھپانا اپنے تمام سربستہ رازوں کو چھپانا ہے، اپنے جذبات و احساسات کو
چھپانا ہے اور اسی پراسراریت Mystry میں اس کا حقیقی حسن مضمر ہے۔ نو آبادیاتی نظام
میں یورپی شخص کا عورت کے ساتھ بہت پیچیدہ تعلق ہے وہ اسے اپنی ملکیت بنانا چاہتا ہے۔

یورپی باشندوں کے لیے یہ بات بہت تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے کہ ایک مقامی عورت
ہر چیز دیکھتی ہے کہ لیکن خود کو اس نے چھپا رکھا ہے۔ وہ کسی مرد کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رکھتی،
نہ مزاج یار میں آ کر سر تسلیم خم کرتی ہے اور نہ خود کو دوسرے کے سامنے پیش کرتی ہے کہ اس
سے اپنی ہوس مٹا سکیں۔ جہاں تک ایک مقامی یعنی الجزائر کے باشندے کا تعلق ہے وہ بھی
مقامی عورت کے ساتھ وابستہ ہے لیکن اس کے مطمع نظر میں کوئی کھوٹ نہیں۔ وہ اسے اپنی
ہوس بھری نظروں سے نہیں دیکھتا۔ اور نہ ہی اس کے دل میں کبھی یہ سوال پیدا ہوا ہے اور نہ
ہی یہ اس کے اعصاب پر کوئی خبط سوار ہوتا ہے کہ راستے یا بازار یا کسی سیر گاہ میں چلتی عورت
پر پہلے ہوس بھری نظر ڈالے اور پھر اسے اپنے اعصاب پر سوار کر کے ذہنی تناؤ کا شکار ہو اور
یہ کیفیت اس پر کبھی غالب نہیں رہی کہ وہ عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بنائے۔

جہاں تک ایک یورپی باشندے کا تعلق ہے وہ نو آبادی میں مقامی عورت کو تاڑتا ہے، غور سے دیکھتا ہے اگر وہ نقاب میں ہے تو اسے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس ادراک سے قبل وہ جارحانہ طور پر ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ بلکہ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کا ردعمل ملا جلا ہوتا ہے جس میں مایوسی اور جارحیت دونوں قسم کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس چیز کی وضاحت ہم اس طریقے سے کر سکتے ہیں کہ پہلے اس میں جارحیت کی ابتدائی صورت پیدا ہوتی ہے اور جب اس کے ہاتھ کوئی چیز نہیں لگتی تو یہ مایوسی میں بدل جاتی ہے۔

علاوہ ازیں مغربی ڈاکٹروں نے بھی اس بارے اپنے تاثرات واضح کیے ہیں کہ جب عورتیں بطور ایک مریض کے ہمارے پاس آتی ہیں تو جب وہ پردہ اتار کر اپنا طبی معائنہ کروانے کے لیے ہمارے ساتھ بات چیت کا سلسلہ شروع کرتی ہیں تو ایک عام مقامی شخص کے لیے بڑی شرم کی بات ہوتی ہے۔ اور وہ یہ بات کہنے پر مجبور ہیں کہ ہم یہ بات آج تک نہیں جان سکے عورت آخر نقاب کر کے اپنی کس چیز کو چھپاتی ہے۔

اس مقام پر ایک مقامی خاتون اور یورپی عورت میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے اول الذکر نقاب لیتی ہے اور اسی میں اپنا حسن وحیا جانتی ہے جب کہ موخر الذکر کھلے چہرے، اور فیشن پرستی کو جدت کے نام پر پوری طرح اپناتی ہے اور اپنے حسن وجمال اور نگاہوں کے غمزے سے مقامی اور اپنے یورپی ہم منصبوں کو اپنی زلف کا آسیر بنانے کے درپے رہتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یورپی باشندہ مسلم اور مقامی عورت کو بے نقاب کیوں کرتا ہے؟ تو اس کا سیدھا سا جواب ہے کہ حقیقت میں یورپی اور روایت پرست اور قدامت پسند لوگوں کو گمراہ کر کے اپنی اقدار سے انہیں بیگانہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے وہ مقامی لوگوں کو آلہ کار بنا کر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے نئی حکمت عملی وضع کرتے ہیں کہ عورت کو بے نقاب کر کے یہ مقصد حاصل ہو سکیں۔ لیکن اس شرمناک، زیرک اور منافقانہ حربے سے کسی کی فطرت تبدیل نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک ایک یورپی باشندے کے خواب کا تعلق ہے تو اس کی حقیقت اور ہیئت پر ژاں پال سارتر نے بہت خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دیگر خواتین کے مقابلے میں ایک یہودی عورت کے اعصاب پر ہر وقت یہ ضبط سوار رہتا ہے کہ کہیں کوئی اس کی عصمت دری نہ کر ڈالے۔ اگر اس قول کی روشنی میں ہم الجزائری لوگوں کی ذہنیت کا اندازہ لگائیں تو اس بات میں ذرہ بھر شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ جب فرانسیسی استعمار نے طاقت کے زور پر الجزائر پر قبضہ کیا تو دیگر یورپی باشندوں کی طرح کئی روز تک نہ صرف قتل وغارت کا بازار گرم رکھا بلکہ خواتین کی بے حرمتی میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس کے بعد لوگوں کے دلوں میں استعمار کے بارے میں یہ تاثر قائم ہو گیا کہ یہ لوگ خواہ جتنے اچھے ہو جائیں اور انسانی دوستی کا لبادہ اوڑھ کر ترقیاتی کاموں کا بہانہ بنائیں لیکن پھر بھی ان کی حقیقت بھیڑ کی کھال میں بھیڑیے سے کم نہیں۔

لہٰذا آغاز ہی میں حاکم اور محکوم کے مابین نفسیاتی طور پر ایک خلیج حائل ہو جاتی ہے جو حاکم کو آمرانہ اور محکوم کو گوسفندانہ بنا دیتی ہے۔ شخصیت کے اس بُعد سے دونوں میں کردار کی ایک نئی جہت پیدا ہوتی ہے جو حاکم کو اپنی مرضی مسلط کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور محکوم کو مجرمانہ سرگرمیوں پر اکساتی ہے۔ ایک یورپی باشندے کے لاشعور میں مقامی عورت ایک خواب کی سی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور اسے ہمیشہ اس طرح کے بے ڈھنگے اور بد اخلاق خواب آتے ہیں جن میں وہ کسی مقامی خاتون کی عزت کے ساتھ کھیل رہا ہوتا ہے۔ جہاں تک عورت کے کردار کا تعلق ہے تو اسے کسی صورت مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ نہ ہی اس کی طرف سے کسی قسم کی آمادگی ظاہر کی جاتی ہے۔ معاملہ صرف یہاں تک نہیں رہتا بلکہ جب اس میں پیش رفت ہوتی ہے تو یورپی باشندہ اپنے خوابوں کو عملی تعبیر دینے کے لیے مقامی عورت سے رابطہ استوار کرنے کی ٹھان لیتا ہے اور یہ چیز ایک حاکم اور محکوم کے مابین ایک نئے تعلق کو جنم دیتی ہے۔

یورپی باشندے اس قدر نفسیاتی مریض ہوجاتے ہیں کہ انہیں خواب میں اکثر مقامی عورتیں نظر آتی ہیں۔ وہ انہیں ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے مدعو کرتا ہے اور انکار کرنے پر خاتون پر ہلہ بول دیتا ہے۔ وہ کمزور مخلوق ہونے کی بنا پر ایک بے بس فاختہ کی طرح پھڑپھڑاتی ہے جسے قید کرنے کے لیے شکاری اپنا جال بچھاتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنالیتا ہے تو اسے موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ (ماہر نفسیات فرائڈ کے مطابق تمام مغربی باشندے جو اس طرح کے خوابوں کے اسیر ہوتے ہیں، نفسیاتی طور پر بیمار ذہن کے مالک ہوتے ہیں) یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو اس کا سیدھا سا جواب ان کی فطری زیرکی ہے۔ وہ مقامی عورت کے ساتھ رابطہ استوار کرنے کا سوچتا ہے لیکن خاتون کے ذہن میں پہلے سے ہی ایک خوف ہے وہ جس کا تجربہ اس نے اپنے ملک پر استعمارانہ قبضے کے وقت کیا تھا۔

اسی طرح ایک یورپی باشندے کو اپنی جارحیت کے آئینے میں مقامی عورت کا اخلاق نظر آتا ہے جو سراسر بزدلی پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اس کی یہی بزدلی منافقت اور دوغلے پن میں بدل جاتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ چیز اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔

ہم یہاں دیکھتے ہیں استعمار کے علمبرداروں نے الجزائری معاشرے کی تباہی کے لیے عورت کو مخصوص مقام دینے میں قدرے جلد بازی سے کام لیا تا کہ اپنے مقاصد کی تکمیل بہتر طریقے سے کرسکیں۔ لیکن یہ ایک فطری بات ہے کہ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے جب محکوم لوگوں نے دیکھا کہ حاکم ان کی تہذیبی تباہی کے درپے ہوگیا ہے تو انہوں نے اسی حکمت عملی کو ناکام بنانے کے لیے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ جب محکوم نے حاکم کی بربریت اور ظالمانہ کارروائیوں کا مشاہدہ کیا تو اس چیز نے اسے اپنے مقامی کلچر کے ساتھ پہلے کی نسبت زیادہ دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ جوڑ دیا۔ حاکم اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے عورت کو بے نقاب کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے اپنی شطرنج کی بساط بچھائی تا کہ اپنے فرزیں اور شاہوں کے

اور یہ پیادہ مہروں کو چت کرسکے۔ اس نے ہر قیمت پر بازی جیتنے کی ٹھان لی لیکن دوسری طرف اسی تیزی سے مقامی لوگوں کی طرف سے مزاحمت بھی شروع ہوگئی۔ یہاں صورت حال نے ایک دم پلٹا کھایا اور حاکم کے ظلم و بربریت نے محکوم کے جسم مردہ میں یک لخت جان ڈال دی جس نے اسے ایک نئی زندگی عطا کی، اس میں نئی روح پھونک دی۔ حالانکہ سالہا سال ایک ہی ڈگر پر چلنے کی وجہ سے مقامی ثقافت جمود کا شکار ہوکر رہ گئی تھی۔ اس جمود کی وجہ اس کے ہاں ہر طرح کی تبدیلی کا فقدان ہوگیا اور یہ حقیقت ہے کہ زندگی مسلسل چلتے رہنے کا نام ہے اسی طرح جب ایک کلچر بھی زندگی کی فطری طرز پر جدت پسند رہتا ہے تو اس میں حسن و عمل کا یہ تسلسل جاری رہتا ہے لیکن جب اس میں یہ جستجو ختم ہوجاتی ہے تو پھر وہ اسے بت بنا کر پوجا جاتا ہے۔ اگرچہ استعمار نے مقامی ثقافت پر حملہ آور ہوکر ظلم کا پرچار کیا لیکن اس سے محکوم جاگ اٹھا۔ اسے اپنے سود و زیاں کا پوری طرح احساس ہوگیا۔ اب وہ نوآبادیاتی نظام کے نفسیاتی قوانین کو پہنچاننے کا قائل ہوگیا۔ لیکن

زخم کے بھرنے تک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

کے مصداق استعمار جو پہلے سے متحرک تھا، وہ مزید متحرک ہوگیا۔ اس نے مقامی تحریک مزاحمت کے ان مراکز کی نشاندہی کرنا شروع کردی تا کہ اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو منظم کرسکے۔ قدرت کا کمال دیکھیں گورے نے نیگرو یعنی سیاہ فام کو جنم دیا لیکن سیاہ فام نے ایک نئی ثقافت کو جنم دیا۔ استعمار عورت کو بے نقاب کرنے پر تلا ہوا ہے جب کہ دوسری جانب نیگرو اس کی مخالفت پر ڈٹا ہوا ہے۔ یہاں استعمار نواز گورا ایک نیا پلان تیار کرتا ہے کہ اب حاکم اور محکوم کے درمیان ایسی مشترکہ چیزیں تلاش کرے کہ جن کے ذریعے اسے مقامی لوگوں میں گھلنے ملنے کا موقع ہاتھ آجائے تا کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے اپنے مقصد کی تکمیل کرسکے۔ اس کے برعکس مقامی باشندے استعمار نواز لوگوں کی اس حکمت عملی سے پوری طرح واقف ہیں اور عورت کو بے پردہ کرنے کی ہر سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے

تیار ہیں خواہ اسے تشدد کا راستہ ہی کیوں نہ اختیار پڑے۔ استعمار یہاں ایک اور قدم بڑھاتا ہے اور اپنے اوپر مدرس کا خول چڑھا کر انسانی دوستی کے ناطے مقامی لوگوں کی تقریبات میں شریک ہو کر ان لوگوں کے تاثرات کا جائزہ لیتا ہے تاکہ وہ مقامی لوگوں میں بڑھتے ہوئے نفرت کے جذبات کے خاتمے کے لیے کوئی درمیانی راہ نکال سکے جو باہمی ہم آہنگی پر مشتمل ہو۔ ان اقدامات کے تحت اس کا اصل مقصد اس جذبے کو روکنا ہے کہ کہیں مقامی لوگ اپنی تہذیبی اقدار کی حفاظت کیلئے استعمار کی طرف سے تہذیبی یلغار کے خلاف مسلح ہو کر میدان میں نہ اُتر آئیں۔

جب استعمار کے خلاف جدوجہد آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو عورت کے کردار میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی اور وہی پردہ جو قدامت پسندی کی علامت سمجھا جاتا تھا اب اس نے نئی جہت، ایک انقلابی جہت اختیار کر لی۔ انقلابیوں کے سامنے وقتی طور پر ضروری نہیں ہوتا ہے کہ استعمار کے خلاف جنگ میں قدیم روایات اور رسم و رواج کی بحالی کا سامان کریں۔ ان کا کام صرف اور صرف سامراج کے خونی پنجوں کو اُکھاڑنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے وقتی طور پر مقامی روایات متاثر ہوتی ہیں لیکن انقلابیوں کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے یہاں الجزائر میں بھی ہمیں جدوجہد آزادی کے دوران یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ انقلابیوں نے اپنا دامن ایسے مسائل اور پیچیدگیوں میں نہیں الجھایا کیونکہ انہیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ ہر انقلاب کو ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

1955ء تک جدوجہد آزادی کا سہرا مردوں کے سر رہا۔ انہوں نے بھی عورت کو میدان کارزار میں لانے کا نہیں سوچا بلکہ ہر انقلابی کی حتمی کوشش ہوتی تھی کہ اس دوران اپنی بیوی یا کسی بھی متعلقہ خاتون کا نام خفیہ رکھے۔ لیکن تحریک آزادی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے مسائل سے دوچار ہوئی جن کو دور کرنے کے لیے فوری اور مناسب حل کی

ضرورت تھی۔ اس کے لیے عورت کو استعمار کے خلاف جدوجہد آزادی کا حصہ بنایا گیا تاکہ وہ اس محاذ پر لڑی جانے والی جنگ میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ حاکموں اور استعمار کے علمبرداروں نے جدوجہد کو دبانے کے لیے اس قدر ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کیے کہ آزادی کے متوالوں کو اپنی حکمت عملی میں مناسب تبدیلیاں کرنا پڑیں تاکہ اس مزاحمت کو اس طریقے سے جاری رکھ سکیں اور اپنے خون سے آزادی کے اس نخل کی آبیاری کر سکیں۔

محاذ جنگ نے کچھ اس طرح کی صورت حال اختیار کر لی کہ عورت کا جنگ میں کودنا ناگزیر ہو گیا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جنگ میں عورت کی مداخلت کا مقصد پورے معاشرے کو متحرک کرنا مقصد نہ تھا بلکہ اس کا سیدھا سادہ مدعا تھا کہ جدوجہد آزادی کی اس تحریک میں عورت بھی ویسی ہی قربانی دے جیسا کہ مردوں نے اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ خاتون ظلم و بربریت کے خلاف جنگ میں اس حوصلے و ہمت کا مظاہرہ کرے اور اس راہ میں پیش آنے والی تمام اذیتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے بالکل اسی طرح جیسے راہ آزادی میں لڑنے والے متوالوں نے حاکم استعمار کے ہاتھوں گرفتار ہو کر پس دیوار زنداں بے پناہ ظلم و تشدد برداشت کیے۔ اس کے لیے عورت کو دو خصوصیات کا حامل ہونا بہت ضروری تھا، ایک اخلاق کی بلندی اور دوسری کردار کی پختگی۔ ایک فطری تقاضے کے تحت عورت اس میدان کارزار میں کودتے وقت ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھی۔ اس حقیقت کو مثال کے ذریعے اس طرح واضح کیا جاسکتا ہے کہ ایک مشین اپنی اہلیت کے مطابق کام کر رہی ہے اگر آپ اس کی استعداد بڑھانا چاہتے ہیں تو اس کا دائرہ کار بھی وسیع کرنا پڑے گا تاکہ پیداواری عمل میں مزید اضافہ کیا جاسکے۔ لیکن یہاں عورت کا کردار یہ نہ تھا بلکہ اسے جدوجہد آزادی میں ایک نیا کردار بلکہ انقلابی کردار ادا کرنا تھا۔

خاتون خانہ بڑی سوچ بچار کے بعد میدان کارزار میں کود پڑی۔ اس نے روایتی مسلم

خاتون کے طور پر اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں جن میں پہاڑوں کے دامن میں جدوجہد آزادی کی جنگ لڑنے والے گوریلا سپاہیوں کی مرہم پٹی کرنا، انہیں خوراک اور زندگی کی دیگر مناسب سہولتیں فراہم کرنا شامل تھا۔ اس جنگ میں بعض مجاہد پہاڑوں کی سنگلاخ چوٹیوں پر موسمی بخار میں مبتلا ہوئے، ان شیر دل مستورات نے بیماروں کی تیمارداری کا بیڑا اٹھایا۔ اس میدان میں مخصوص کردار ادا کرنا یقیناً ایک انقلابی قدم تھا۔ ان کے اقدامات کا مقصد انقلابی جدوجہد کو ہر صورت میں منزل مقصود سے ہمکنار کرنا تھا۔

اس تمام جدوجہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ عورت نے استعمار نواز حاکموں سے ہمیشہ دامن چھڑانے کی کوشش کی۔ جب گورے حاکموں نے اسے مجبور کیا کہ اپنا پردہ اتار کر مقامی تہذیب کی تباہی کے کام میں ان کا ہاتھ بٹائے تو عورت نے ہمیشہ اپنا دامن چھڑایا اور ان کی آلہ کار بننے سے اعراض کیا۔ حاکموں کے اس رویے کے خاص طور پر شہری عورتوں پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ اس کے ذہن کا سکون اور دل کا ثبات جاتا رہا۔ عورت ایک نئی نفسیاتی الجھن کا شکار ہو کر رہ گئی۔ کیونکہ روایتی طرز زندگی اور اپنی فطری ساخت کے تقاضوں کے تحت وہ گھر کی چاردیواری میں رہنے کی عادی تھی۔ اب اس کے لیے جدوجہد آزادی کے دوران سنگلاخ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جانا، سرعام کھلے راستوں یا سڑکوں پر چل کر کارزار حیات میں حصہ لینا، اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اس کے دل میں رہ رہ کر خیال آ رہے تھے کہ آپ وہ جدوجہد آزادی میں کوئی کردار ادا کر سکے گی یا نہیں۔

خود تحریک آزادی (Liberation Front) کے رہنما بھی اس صورت حال سے پریشان تھے کہ آیا عورت کو میدان جنگ میں گھسیٹنے سے ان کی منزل قریب ہو جائے گی یا انہیں نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ خدشے کے پیش نظر تمام رہنما عورت کو میدان جنگ میں دھکیلنے سے گریز کر رہے تھے۔ یہ معاملہ کئی روز تک سردرد بنا رہا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جنگ آزادی کے کارکن اور رہنما دشمن کی طرف سے آزادی کے متوالوں کے خلاف روا

رکھے جانے والے مظالم سے بخوبی واقف تھے۔ اس نے اس بات میں ذرہ بھر ابہام نہیں تھا کہ استعمار آزادی کے متوالوں کے ساتھ کس طرح کا ذلت آمیز سلوک کرتا ہے۔

رہنماؤں کی طرف سے اس طرح کے خدشات محض غلط فہمی یا مبالغہ آرائی نہ تھے بلکہ ان کی اکثریت فرانسیسی جیلوں میں قید ہونے اور ذلت ناک صعوبتیں برداشت کرنے کا تجربہ رکھتی تھی۔ رہنماؤں میں سے ہر ایک اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اگر تحریک آزادی میں حصہ لینے والی کوئی بھی عورت دشمن کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ نہ صرف اسے تشدد کا نشانہ بنائیں گے بلکہ اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد اسے موت کے گھاٹ اُتارنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ اس لیے جو کوئی عورت اس کٹھن راہ پر چلے گی اس کا لازمی نتیجہ موت کو گلے لگانے کے مترادف ہوگا۔ مختصر یہ کہ ان تمام تلخ حقائق کے باوجود اس بات کا فیصلہ کرنا تھا کہ عورت کو جدوجہد آزادی کا حصہ بنایا جائے یا نہیں۔ اس بارے بار بار مشاورت کی گئی لیکن ہر مرتبہ ہچکچاہٹ آڑے آ جاتی جس کا نتیجہ سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اس نئی طرز جنگ کے حوالے سے مبصرین اس بات کا بخوبی مشاہدہ کر کے حقائق کا انقلابی جائزہ لے چکے تھے کہ آیا خاتون مزاحمتی جنگ میں براہ راست مناسب کردار ادا کر سکتی ہے یا خفیہ ایجنٹ کے طور پر اپنے فطری جوہر دکھا سکتی ہے۔ طویل مشاہدے کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ عورت دونوں محاذوں پر بہترین کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے خواہ یہ جنگ کا میدان ہو یا سراغرسانی کا امتحان، انقلابی عورت نے اپنے کردار سے ثابت کیا کہ وہ محض ایک سراغرساں "Secret Agent" نہیں بلکہ معرکہ حق و باطل میں ایک اہم کردار بھی ہے جب وہ بازار میں چلتی ہوئی نظر آتی ہے تو بظاہر ایک حسن و جمال کا پیکر، لوگوں کو لبھانے والی، حریص آنکھوں کو للچانے والی لگتی ہے لیکن حقیقت میں اس کے پرس (Bag) میں دو یا تین دستی بم (Hand Gernades) ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ متعلقہ جگہ پر کی جانے والی کارروائی کی خفیہ رپورٹ موجود ہوتی ہے جسے اس نے اپنی انگیا

میں چھپایا ہوتا ہے۔ اپنی متعلقہ کارروائی کرتے وقت اسے کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں ہو
جس طرح کہ اس نے عام ناولوں یا مار دھاڑ والی فلموں (Action movies) میں دیک
ہوتا ہے۔ اس کے کردار میں مغربی طرز پر کسی قسم کی نقالی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔

ادبی حوالے سے اس بات کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی ایسی کہانی
کردار نہیں جو سینکڑوں بار سوچنے سے ہمارے تخیل میں آتی ہے بلکہ یہاں وہ ایک زندہ جی
جاگتا ایک انقلابی کردار ہے جس کی نمود صدق و اخلاص سے ہوئی۔ یہاں نمائش یا فرضی
نقالی کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ایک ایسا ڈرامہ ہے جسے حقیقت کی دنیا میں فلمایا گیا ہے۔ ایک
تسلسل ہے اس حقیقت کا، یہ اظہار ہے اس سچے جذبے کا کہ ایک عورت نے کس طرح اپ
آپ کو ایک انقلابی کے سانچے میں ڈھال لیا۔ بالآخر الجزائر کی عورت نے خود کو براہ راست
سانحہ (Tragedy) کے لیے پیش کر دیا۔

جیسے جیسے محاذِ جنگ کا دائرہ کار بڑھتا گیا، قیادت کے لیے نئے نئے مسائل پیدا ہو
شروع ہو گئے۔ کہیں منصوبوں کی مالی امداد کا مسئلہ، کہیں سراغ رسانی کا فکر، اور اس پر ا
کارکنوں کی سیاسی تربیت کا انتظام۔ علاوہ ازیں ان تمام شعبوں کو امداد کی فراہمی کے لی
ہنگامی سیل کا قیام اور دشمن کے حملوں کی وجہ سے اس کی تباہی کی صورت میں مزید ای
مقامات (Cell) کا نظام جس کی تشکیل کے لیے وسائل پہلے سے ہی موجود ہوں۔ ان ڈھی
سارے مسائل میں رہنماؤں نے بار بار عورت کو آزادی کی اس جدوجہد میں داخل کرنے
سوچا لیکن ہر مرتبہ یہی بات مشکل آڑے آئی کہ استعمار قیدی عورتوں کے ساتھ ذلت آمی
سلوک کرے گا۔ لیکن جوں جوں گوریلا جنگ کا دائرہ کار پھیلتا گیا اسی طرح رہنماؤں
غور و فکر مزید پختگی اختیار کرتا گیا۔ بالآخر انہوں نے احتیاط و تدبر کے ساتھ عورت کو محاذ جنگ
پر لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اسی حکمت علی کے آغاز میں لبریشن فرنٹ کی قیادت نے شادی شدہ عورتوں کو اس مش

لگایا اور ان کو مستورات ونگ میں منتخب کیا تا کہ وہ اپنے فرائض منصبی سرانجام دے سکیں۔
اس کے بعد ان کے انتخاب میں مزید پابندیاں عائد کر دی گئیں کہ مستورات فوج میں صرف
ان خواتین کا انتخاب کیا جائے گا جن کے خاوند پہلے سے لبریشن فرنٹ میں فوجی فرائض
سرانجام دے رہے ہیں جبکہ کنواری لڑکیوں کے لیے معاشرتی پابندیاں تھیں کہ اپنے محرم
کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ تنہا سفر نہیں کر سکتیں۔ لیکن جب جنگ کا دائرہ کار مزید وسیع
ہوا تو پھر قیادت نے تمام تر پابندیاں اٹھا کر کنواری لڑکیوں کو بھی جنگ میں شامل ہونے کا
موقع فراہم کر دیا۔

گوریلا جنگ میں اگرچہ عورت مرد کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے تیار تو ہو گئی لیکن
ابتدائی سطح پر اسے تنہا نہ چھوڑا گیا بلکہ وہ مرد سے چند سو قدم آگے چلتی لیکن اس کی ہدایات کے
بغیر ایک قدم تک نہ اٹھاتی۔ یہ حکمت عملی صرف عام شہروں کی نسبت تھی لیکن جب جنگ کا
دائرہ کار فرانسیسی استعمار کے نئے تعمیر کردہ شہروں تک بڑھا تو عورت نے مزید انقلابی جذبے
کے تحت اپنا نقاب اُتار دیا۔ لیکن یہاں اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ اس نے ہوس
پرستی کے تحت ایسا کیا، بلکہ اس کا مقصد استعمار کے خلاف پنجہ آزمائی کے دوران ثابت قدمی
اور اپنی بہادری کے جوہر دکھانا تھا جو کہ بعد کے تجربات سے سچ ثابت ہوا۔ عورت نے بہت
جلد اپنی بہادری کا لوہا منوایا اور دشمن کے خلاف جارحانہ حکمت عملی اختیار کی۔

یہاں ایک اور بات جو قابل غور ہے وہ یہ کہ جب محکوم اور پسے ہوئے لوگ استعمار کے
خلاف کوئی پیش قدمی کرتے تو انہیں اپنی کارروائی کے دوران ایک بات کا خیال رکھنا پڑتا کہ
کہیں متبرک اور ممنوعہ مقامات ان کے غضب کا نشانہ نہ بنیں۔ مغربیوں نے اپنے آپ کو
محفوظ کرنے کے لیے مقامی لوگوں سے بالکل علیحدہ شہر بسائے تا کہ بغاوت کے وقت وہ حتی
المقدور باغیوں کے انتقام سے محفوظ رہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی
مکاری کی کہ اپنے تمام شہر اس جگہ تعمیر کیے جہاں سے مقامی لوگوں کے شہروں کو داخل ہونے

کا راستہ تھا۔ اس طرح انہوں نے نئے شہروں کی تعمیر کے ذریعے مقامی لوگوں کے شہروں کا محاصرہ کر لیا۔ الجزائری لوگوں کے شہر کا باہر کو جانے والا راستہ یورپی کالونیوں سے ہو کر جاتا تھا۔ اس کے لیے تمام شہر اس بات کا ثبوت ہیں مثلاً اوران، بلاوہ، بون، ہر کہیں یہی مکارانہ حکمت عملی اختیار کی گئی۔

فرانسیسی غاصبوں کے گھروں میں خدمات سرانجام دینے والی خواتین اکثر بڑی عمر کی ہیں جنہیں اکثر و بیشتر فاطمہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ جہاں تک نوجوان لڑکیوں کا تعلق ہے وہ صرف عرب شہروں تک محدود رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ عرب شہروں میں بھی ان کی سرگرمیاں مبالغہ آرائی کی حد تک کم کر دی گئی ہیں۔ معاشرتی زندگی کے حوالے سے بہت کم مواقع ایسے آتے ہیں جب مقامی عورت گھر سے باہر نکلتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی مذہبی تقریب کے موقع پر اسے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ گھر سے باہر جانا نصیب ہوتا ہے یا پھر کسی قریبی رشتہ دار کی موت واقع ہونے پر اسے آخری رسومات میں شرکت کیلیے جانا پڑتا ہے۔
اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ایک عورت جسے اپنے عرب معاشرے میں کھلم کھلا پھرنے کی اجازت نہیں، وہ مغربی شہروں میں کیسے جاسکے گی۔ لیکن یہاں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ ایک طرف سامراجی یلغار دوسری جانب عورت کا وقار، لیکن بالآخر اس نے اپنے آپ کو آزادی کی جنگ کے لیے پیش کر دیا۔ اسے ہر حال میں اپنے فرائض منصبی ادا کرنا ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے نئی راہ اختیار کی یعنی جب وہ الجزائر میں بسائے گئے فرانسیسی شہروں کا رخ کرتی ہے تو گاڑی پر سفر کرنا اپنے لیے زیادہ مناسب خیال کرتی ہے۔ یہاں نفسیاتی طور پر ایک چیز واضح ہو جاتی ہے کہ وہ خاتون جس نے کبھی تن تنہا اپنے شہروں میں سفر نہیں کیا وہ دشمن کے علاقے سے کیسے گزر سکے گی۔ جہاں جگہ جگہ پر رکاوٹیں اور پولیس اہلکاروں کی تفتیشی چوکیاں ہوتی ہیں۔ ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انقلابی عورت کو اپنی ہچکچاہٹ ختم کرنا ہوگی جو کہ ڈر اور اندرونی خوف کی وجہ سے اس

پہاڑی وادی نظر آرہی ہے۔ اس کے علاوہ اسے اپنے لڑکپن اور بچوں جیسے خوف پر قابو پانا ہوگا تاکہ اس وادی پُر خار سے کامیابی کے ساتھ گزر سکے۔

نوآبادیاتی نظام میں استعمار کے علمبرداروں نے مقامی لوگوں کے ساتھ قدم قدم پر غلط بیانی اور وعدہ فراموشی کی۔ اس کے پس پردہ محرک یہ تھا کہ وہ مشرقی ممالک میں اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتا تھا لیکن دوسری طرف مجاہدین آزادی اپنی جدوجہد کے دوران انقلابی کامیابیوں سے ہمکنار ہو رہے تھے۔

انقلابی عورت نے اس میدان میں کبھی سستی یا غفلت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جب بھی اسے کسی مشن کی تکمیل کے لیے بلایا گیا اس نے فوراً لبیک کہا اور انقلابیوں سے رابطہ کرکے نہ صرف اپنے فرض کا انتخاب کیا بلکہ پوری تندہی سے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس طرح عورت قریہ بہ قریہ، بستی بستی قائم ہونے والے نیٹ ورک میں مل کر انقلابیوں کے مابین بننے والی زنجیر کا حصہ بنی۔ اس دوران وہ فطری طور پر اس قدر ذہین واقع ہوئی کہ اپنی ناخواندگی کے باوجود اس نے انقلابیوں کے خفیہ پیغامات زبانی یاد کر لیے۔ اسے پوری طرح خبر تھی کہ اگر وائرلیس پر کوئی پیغام موصول ہو تو کس طرح خفیہ انداز میں اس کا جواب دینا ہے۔ اسی طرح اسے لبریشن فرنٹ کے ضلعی رہنماؤں کے ساتھ ملنے کا موقع نصیب ہوا جو اپنے نظریہ و حکمت عملی کی تبلیغ کے لیے ہر وقت سفر پر رہتے۔

اس مقام پر انقلابی عورت کو ایک نئے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہے۔ اسے چاہیے کہ کسی ایک جگہ کھڑے ہونے سے اعراض کرے کیونکہ یہ اس کے لیے نئی مشکلات کا سبب بن سکتا ہے۔ جب مرد ایک نوجوان الجزائری خاتون کو دیکھتے ہیں تو اس پر پھبتیاں کستے ہیں۔ اسے اپنی پُر ہوس نگاہوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک نفسیاتی کشمکش کا شکار ہو جاتی ہے اور ان غیر ذمہ دار لوگوں کی ان سرگرمیوں پر اپنے دانت پیستی اور انگلیاں کاٹتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ لیکن

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اس بات کا غالب امکان ہے کہ مجاہد عورت کے پرس (Bag) میں لاکھوں روپے موجود ہوں جو اس نے انقلابی تحریک کے دیگر لوازمات پورے کرنے کے لیے اپنے پاس رکھے ہوں، مثلاً زخمیوں کی دیکھ بھال کرنا، قیدیوں کے خاندانوں کی کفالت کرنا، بیماروں کے لیے ادویات فراہم کرنا اور گوریلا دستوں کو سامانِ حرب وضرب پہنچانا وغیرہ وغیرہ۔

الجزائری خاتون نے اس رزم حق وباطل میں قدم رکھنے کے بعد کس طرح کی حیل و حجت سے کام نہیں لیا بلکہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کمال ضبط اور مستقل مزاجی سے کام لیا اور اپنی انہی دو شمشیروں سے اس نے کامیابی کی منازل طے کیں۔ اگرچہ اس کے راستے میں کئی رکاوٹیں آئیں، کبھی خاندان والوں نے اس کے اس مشن کی خلاف ورزی کی، کبھی خود اس کی ذاتی کمزوریوں نے دامن پکڑا۔ لیکن اس نے اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر ایک ایک کر کے تمام کمزوریوں پر قابو پالیا اور تمام رکاوٹیں دور کر کے اپنے راستے پر گامزن ہوگئی۔

جب انقلابی رہنما قریہ قریہ، شہر شہر لوگوں سے رابطہ کرتے اور نوجوان لڑکیوں کو اپنی انقلابی جماعت میں شامل ہونے کی دعوت دیتے تو اس بات نے ان کے لیے نئے مسائل پیدا کر دیے۔ ان کی یہ سرگرمیاں خفیہ ایجنسیوں اور پولیس اہلکاروں سے پوشیدہ نہ رہیں۔ استعمار نواز پولیس پوری طرح حرکت میں آ گئی تاکہ آزادی کے متوالوں کو ابتدائی سٹیج پر ہی ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو جائے۔ فرانسیسی انتظامیہ میں پولیس چیف خود ان شہروں میں گردش کرتے اور انقلابیوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے۔ انہوں نے انقلابیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں ہر قسم کا مواد اکٹھا کر لیا اور کوئی انقلابی کارکن ایسا نہ تھا جس کی تصویر پولیس سپرنٹنڈنٹ کی میز پر موجود نہ ہو۔

گوریلا فوجی اپنے ساتھ ہر وقت ہتھیار اٹھائے مستعد رہتے۔ ان ہتھیاروں میں خود

کار (Automatic) پستول، ریوالور Revolver اور گرنیڈ ہوتے۔ سیاسی وانقلابی رہنما اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ اگر کوئی انقلابی پولیس کے ہاتھ چڑھ گیا تو کوئی ایسا راستہ ہونا چاہیے کہ کم از کم اس کے پاس موجودہ سامان اور رقم کو بحفاظت لبریشن فرنٹ کے مرکز تک پہنچایا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے عورت نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ وہ کسی مہم کے دوران انقلابیوں سے چند قدم آگے چلتی، وہ ان کے لیے چراغ راہ تھی جو راستے میں آنے والی رکاوٹوں کا پتہ دیتی، اور ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے حکمت عملی وضع کرتی۔ جب راستے میں چلتے ہوئے اسے کسی خطرے کا گمان گزرتا تو فوری طور پر اپنے پیچھے آنے والے انقلابیوں کو خبردار کرتی۔ اسی طرح اگر کوئی انقلابی شک کی بنیاد پر گرفتاری کے قریب ہوتا تو آخری حد تک کوشش کرتا کہ مہم سے متعلقہ راز و نیاز کسی وفادار ساتھی کے حوالے کر دے۔ اس کام کو سرانجام دینے کے لیے عورت ایک معقول ذریعہ تھی۔

ادھر استعمار نواز پولیس مزید چوکنا ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ تحریک آزادی تمام رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس تذبذب کی صورت حال میں پولیس نے مشتبہ علاقوں میں بار بار گشت شروع کر دیا تاکہ ذمہ دار افراد کا سراغ لگایا جا سکے۔ تحریک آزادی 1956ء میں ایک نئے خطرے سے دوچار ہوئی جس میں عورت نے فرار اختیار کرنے کے بجائے ایک قدم آگے بڑھ کر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ جب مغربی استعمار نے تحریک آزادی کو دبانے کے لیے پہاڑوں اور میدانی علاقوں میں عام شہریوں کا قتل عام شروع کر دیا تو سیاسی وانقلابی قیادت کو خیال آیا کہ شہریوں کو غیر ملکی استعمار کے ہاتھوں قتل عام سے بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ دشمن کے خلاف تشدد کا راستہ اپنا لیا جائے۔ قیادت اس بات کی ابھی تک خلاف ورزی کرتی آ رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک سیاسی قیادت اس بات کا صحیح اندازہ نہ کر سکی اور نہ ہی تجزیہ کر سکی ہے کہ کس چیز نے انقلابی تحریک کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا جو کہ استعمار کی نظر

میں کھلم کھلا ''دہشت گردی'' Terrorism کے مترادف ہے۔

فرانسیسی استعمار کے خلاف مزاحمت کے دوران بنیادی مقصد غیر ملکی فوجیوں کو نشانہ بنانا ہوتا تھا، خاص طور پر ان فوجیوں کو جنہوں نے مقامی لوگوں کے مقابلے میں اپنی پوزیشنیں سنبھالی ہوئی تھیں۔ یہ جہادی کارروائیاں ایک ہی نوعیت کی ہوتی تھیں خواہ انفرادی طور پر کی گئیں ہوں یا اجتماعی طور پر۔ ان کارروائیوں میں بعض اوقات براہِ راست دشمن کو نشانہ بنایا جاتا اور بعض اوقات ریل کی پٹڑی کو بموں سے اڑا دیا جاتا۔ یہ حقیقت ہے کہ الجزائر میں مغربی تعداد میں چیدہ چیدہ تھے لہٰذا جہادی ملیشاء کو ان کی گنتی کرتے وقت زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ اور تحریک کا حصہ بننے والے شخص کے لیے اس طرح کی چیزیں کبھی مسئلہ نہیں بنیں۔

جہادی کارروائیوں کے حوالے سے یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ گلی کوچوں میں عام شہریوں کے قتل کا معاملہ اس قدر آسان نہیں۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی سنگ دل کیوں نہ ہو، وہ اس بات پر آسانی سے آمادہ عمل نہیں ہوتا۔ کسی عوامی جگہ پر بم نصب کر کے کوئی شخص اپنے ضمیر کے خلاف جنگ نہیں کر سکتا۔ جنگ آزادی کے رہنما اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اگرچہ عوامی جگہوں پر خوف و ہراس پھیلا کر انسان خود اپنے ضمیر کی پکڑ میں آ جاتا ہے لیکن جہاں تک مخصوص قسم کی کارروائیوں کا تعلق ہے اس سے متعلق انسان کو اخلاقی جواز پیدا کرتے وقت کوئی خاص مشقت نہیں کرنا پڑتی۔ یہاں تک کہ کئی مرتبہ ایسا ہوا انقلابی رہنماؤں نے پہلے کسی جگہ بم نصب کرنے کا فیصلہ کیا اور بعد ازاں شہری آبادی کے جانی و مالی نقصان کے خیال نے انہیں اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کیا۔ انہوں نے فدائیوں کو بروقت واپس بلانے کے احکامات جاری کر دیے۔ اس ہچکچاہٹ کی بڑی وجہ ماضی کی وہ تلخ یادیں تھیں جو انقلابی رہنماؤں کے ذہنوں میں کانٹا بن کر اٹکی ہوئی تھیں، کیونکہ ان کارروائیوں کے دوران شہروں کی اکثریت بری طرح شدید زخموں سے دوچار ہوئی۔

دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ سیاسی محاذ پر تحریک آزادی کے لیے کام کرنے والے رہنما کسی ایسے اقدام کی اجازت دینے سے اعراض کرتے تھے جو آزادی کے مسئلہ پر سودے بازی کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی فکر دامن گیر تھی کہ لبریشن فرنٹ میں بعض صدق و وفا کے پیکر مغربی افراد بھی خدمات سرانجام دے رہے تھے اور لبریشن فرنٹ ان کی خدمات سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تحریک آزادی تین امور کے بارے میں بڑی پریشان تھی جن کا اوپر تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے یعنی شہریوں کے قتل عام سے باز رہنا، سیاسی تحریک کے ساتھ براہِ راست محاذ آرائی سے گریز کرنا اور عالمی سطح پر تمام جمہور نواز حکومتوں کی اخلاقی اور نظریاتی حمایت سے بہرہ مند ہونا۔ یہ ایسی حقیقتیں تھیں کہ جب تحریک آزادی نے عملی طور پر کچھ فاصلہ طے کیا تو یہ تین پہلو سامنے آئے۔

نیشنل لبریشن فرنٹ اس مقام پر پہنچتے تک مزید فوائد سے ہمکنار ہونے کے بجائے الٹے نقصان سے دوچار ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ جب فدائیوں نے کارروائیاں کیں تو اس سے الجزائر کے عام شہریوں کی ہلاکتیں ہوئیں جس پر شہریوں کی بڑی تعداد اس تحریک سے بیزاری کا اظہار کرنے لگی۔ دوسری جانب اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ استعمار نواز طاقتوں نے انقلابیوں کے خلاف عوامی نفرت پھیلا کر اپنے پنجے مضبوط کرنا شروع کر دیے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ چند گوریلا جہادی ایک عوامی مقام سے گزرے کہ ایک کلرک خاتون نے انہیں دیکھتے ہی چلانا شروع کر دیا کہ یہی ہیں وہ دہشت گرد سرکار کو جن کی تلاش ہے۔

فرانسیسی استعمار نے اپنی پوزیشن مزید مستحکم کرنے کے لیے اپنے قدم جمانے شروع کر دیے۔ اِدھر اسلحے اور فوجیوں کی ریل گاڑیاں بھر بھر کر لائی جا رہی ہیں، اُدھر ان کے جنگی جہازوں کی پروازیں فدائیوں کے ٹھکانوں کو نشانہ بنا رہی ہیں۔ پورے ملک میں استعمار کے علمبرداروں نے عجیب و غریب قسم کا خوف و ہراس پھیلا دیا جس سے عوام الناس کو احساس تنہائی ہونے لگا۔ انہوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اب غیر ملکی استعمار کسی قیمت پر ختم نہیں کیا

جا سکتا کیونکہ انسانی حفاظت کا کوئی سامان نظر نہیں آتا۔ مغربی درندے ہر کہیں دندناتے پھرتے ہیں جن کے سامنے رکاوٹ کھڑی کرنے والا نظر نہیں آتا۔ المختصر یہ کہ لوگوں کو قحط الرجال کا احساس ہونے لگا۔ اس کے علاوہ مغربی استعمار کا حوصلہ (Morale) اس قدر بلند ہو گیا کہ انہوں نے برسرعام پراپگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ اگر عوام شورش پسند افراد کی نشاندہی کرنے میں ہماری مدد کرے تو ہم آنکھ جھپکنے میں ان کے تمام مسائل حل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ خطے میں کچھ ایسے لوگوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا جن کا مقصد لوگوں پر تشدد کرنے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ جب مغربی انتظامیہ نے اعلان کیا کہ ان کو بہت جلد بے نقاب کر دیں گے تو ان لوگوں نے اپنے آپ کو چھپانے میں اتنی جلدی کی کہ ان کی تمام شیخی دھری کی دھری رہ گئی۔

لوگوں میں تذبذب کے جذبات تیزی سے پھیلنے لگے۔ انہوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ آیا استعمار کے خلاف ان کی جدوجہد بار آور ثابت ہو سکتی ہے یا وہ یونہی صحرا میں سراب کو پانی سمجھ کر اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ بعض لوگ اس قدر بے صبرے ہو گئے کہ انہوں نے اس پُر خار راستے ہی کو خیر باد کہنے کی ٹھان لی تاکہ روزمرہ کے استعماری تشدد سے اپنے آپ کو محفوظ کر سکیں۔ اس طرح لوگوں میں عزم و ہمت جواب دینا شروع ہو گئے۔ ان کے عزیز و اقارب کو آزادی کی تحریک میں شامل ہونے پر جیل کی سلاخوں کے پیچھے پھینک دیا گیا جب کہ دوسری جانب وہ اپنی زبانوں پر حرف شکایت لانے کے لیے مجبور تھے۔ اس چیز نے قیادت کو استعمار کے خلاف جنگ میں نئے طریقے استعمال کرنے پر ابھارا۔

قیادت نے نئی حکمت عملی کے تحت خود فرانسیسی پولیس اور فوجیوں کی چوکیوں کا سراغ لگانا شروع کر دیا اور ان کے نقشے تیار کیے کہ کس علاقے میں کون سی پولیس چوکی واقع ہے۔ خاتون نے اس میدان میں بہت آئیڈیل کردار ادا کیا۔ اس نے اپنے پرس (Hand Bag) میں پستول، گولیاں اور ہینڈ گرنیڈ رکھے اور اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے چل نکلی اور

یہاں انہیں اس اسلحے کی ضرورت ہوتی وہ اس خاتون سے حاصل کر لیتے۔ اس طرح انہوں نے مغربی فوجیوں کی رہائش گاہوں اور قحبہ خانوں کو بھی نشانہ بنایا۔ ردعمل کے طور پر فرانسیسی فوجیوں نے اپنے شہروں میں الجزائری شہریوں کو گرفتار کر کے انہیں پس دیوار زنداں ڈالنا شروع کر دیا۔

یہاں ہم انقلابی مرد و عورت کو شانہ بشانہ دیکھتے ہیں کہ دشمن کو موت کے گھاٹ اتارنے میں ان دونوں میں کس درجے کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ ایک انقلابی جدوجہد ہے، استعمار کے خلاف ایک جارحانہ کشمکش۔ ان دونوں میں ایک عجیب قسم کا رشتہ ہے۔ بیک وقت ایک دوسرے کے حامی و مددگار، ہم منصب، ہم فکر، لیکن حکمت عملی کے حوالے سے ایک دوسرے سے جدا۔ عورت، بظاہر مغربی روایات کے سانچے میں ڈھلی، گھریلو ذمہ داریوں سے بے نیاز، انقلابیوں کی مددگار، اور مرد ایک اجنبی، استعمار کا ستایا ہوا اپنی منزل سے دور، دل میں جذبہ و ایمان کی دولت لیے آزادی کے پُر خار راستوں پر رواں دواں۔

الجزائر کا فدائی مغربی فوجیوں کی طرح اپنی قوت مدافعت بڑھانے کے لیے کوئی نشہ آور ادویات استعمال نہیں کرتا۔ اسے کسی خطرے سے نابلد ہونے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی وہ کسی بڑی کارروائی کے لیے بد دل ہوتا ہے۔ جب اسے کسی فرانسیسی چوکی یا تھانے پر حملہ آور ہونے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے تو وہ اسے خندہ پیشانی سے قبول کر لیتا ہے۔ وہ موت سے پہلے ہی اپنے آپ کو مار لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے سر پر کفن باندھ کر انقلاب برپا کرنے کے لیے نکلتا ہے تاکہ معاشرے کو استعمار کے خونی پنجوں سے آزاد کرا سکے۔ اس دوران نہ کبھی موت کے خوف نے اس کا دامن پکڑا اور نہ ہی اس کے پایۂ استقلال میں کمی واقع ہوئی بلکہ وہ

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم
جو چلے تو جاں سے گزر گئے

کی سچی تصویر بن جاتا ہے۔

ایک انقلابی عورت جس نے عظیم مقصد کے لیے مغربی طرز اختیار کر لی ہے حقیقت میں وہ انقلابیوں کا ایک حصہ ہے اس کے پرس (Bag) میں خودکار پستول Automatic Pistol ریوالور (Revolver) کارتوس اور نہ جانے کتنے ہی جعلی شناختی کارڈ ہیں جو اس نے پولیس کو دھوکا دینے کے لیے اپنے پاس رکھے ہیں۔ جب وہ گشت کرنے والے فوجی دستے کے پاس سے گزرتی ہے تو ہر کوئی اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے ہر ایک اپنی ہوا و ہوس کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتا۔ کوئی اس پر پھبتی کستا ہے تو کوئی آوازے، نہ جانے اس دوران اسے کن کن ذہنی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے زندہ ضمیر اور سچے جذبوں کے ساتھ اپنے طے شدہ راستوں پر چلی جا رہی ہے۔ فرانسیسی فوجی انجانے میں فحش اور اوباش حرکتیں تو کر رہے ہیں لیکن انہیں اس بات کا پتہ نہیں کہ لڑکی کے بیگ میں پستول اور دیگر قسم کا خطرناک اسلحہ موجود ہے کہ اس کی ایک کارروائی سے گشتی پولیس کے چار پانچ آدمی وہیں ڈھیر ہو سکتے ہیں۔

کل تک یہ لڑکی الجزائر میں بسائے گئے مغربی شہروں میں تنہا چلنے سے لرزاں تھی لیکن آج جب اس نے اپنے آپ کو ایک بڑے مشن کے ساتھ وابستہ کر لیا ہے۔ اس کے ذہن سے خوف نکل گیا اس کے فیصلوں سے تذبذب ختم ہو گیا۔ اب اس نے اپنی ہر جنس گرانمایہ آزادی کی دیوی پر قربان کر دی۔ اس کی چال میں وہ لڑکھڑاہٹ نہ رہی نہ اس کے قدموں میں ڈگمگاہٹ رہی۔ اب وہ پریشان افکار کے حامل لوگوں کی طرح نہیں چلتی بلکہ اس کی چال میں ایک وقار آ گیا۔ اس کے کمزور کندھوں میں نظریہ آزادی کے ساتھ وفاداری کی وجہ سے ایک قوت آ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے تمام خطرات کو پس پشت ڈال کر آزادی کے حصول کو اپنا مقصد بنا لیا ہے۔

روایتی معاشرے میں پردہ انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے یہ عورت کا سنگھار ہے۔ اس

[illegible] ہے، اس کا حسن ہے۔ پردہ لے کر وہ اپنے آپ کو زیادہ محفوظ تصور کرتی ہے۔ پردہ اس کے جذبات کا نگہدار ہے لیکن جب وہ پردہ اتارتی ہے تو اس کے ذہن میں خوف جنم لیتا ہے ایک ایسا خوف جو ہر وقت اس کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ ہر وقت اسے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی درندہ صفت مرد اس کی آبروریزی نہ کرے، کہیں اس کی عزت ارزاں قیمت پر سر بازار نیلام نہ کر دی جائے۔ اسے خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں مغربی فوجی اس کی عصمت کا دامن تار تار نہ کر دے۔ المختصر اسے بے پردگی کی حالت میں ننگے پن کا احساس ہوتا ہے۔ گلیوں، بازاروں میں چلتے وقت اسے اپنے جسم میں عجیب قسم کی سنسنی خیزی محسوس ہوتی ہے لیکن اس تمام نفسیاتی الجھن کے باوجود وہ اپنے راستے پر ثابت قدم رہتی ہے۔ اگر اس نے اس راستے پر چلنے کا فیصلہ کر لیا تو اسے اپنی نفسیاتی الجھنوں پر قابو پانا ہوگا جس کے لیے وہ اپنے آپ کو نئے روپ میں ڈھالتی ہے۔ وہ اپنی شخصیت کی تشکیل نو کرتی ہے، وہ اپنے جسم میں نئی روح پھونکتی ہے۔ آزادی کی روح...... عزت واحترام کی روح...... جہد مسلسل کی روح...... قربانی وایثار کی روح، ایک انقلابی روح۔

الجزائری خاتون کوئی تنہا یا خزاں رسیدہ درخت کا پتہ نہیں، بلکہ وہ انقلابی مشن کا ایک اہم جزو بن چکی ہے۔ وہ ظلم کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے قابل ہو چکی ہے اور ہائی کمان کی طرف سے اسے جو بھی ہدف سونپا جاتا ہے وہ اسے انتہائی کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچا کر واپس لوٹتی ہے اور اپنے اس مشن کی کامیابی کا مژدہ اپنے سینئر کمانڈر کو سناتی ہے کہ سر! کام ہو گیا (Mission Accomplished)۔

انقلابی جدوجہد کے آغاز میں جب عورت کو میدان کارزار میں شامل کیا گیا تو تنظیم کو سماجی حوالے سے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جب کوئی انقلابی خاتون جو بظاہر بے پردہ ہوتی کسی دوست یا رشتہ دار کو نظر آتی تو وہ فوراً خاتون کے والد سے شکایت کرتا کہ میں نے فاطمہ یا زہرا نامی آپ کی صاحبزادی کو یوں آوارہ لڑکیوں کی طرح سڑکوں پر پھرتے

دیکھا۔اول مجھے غیرت آئی لیکن میں براہ راست اس پر کوئی بندش نہیں لگا سکتا تھا۔پھر خیال
آیا کہ آپ سے رابطہ کروں۔ صاحب! یہ بڑی بے عزتی اور شرم کی بات ہے ہمارے
خاندان کی لڑکیاں تو دروازے سے جھانکنے کو بھی معیوب خیال کرتی ہیں لیکن ایک یہ لڑکی
ہے کہ انقلابیوں کے ساتھ مل کر اپنی حیثیت ہی کھو بیٹھی ہے وغیرہ وغیرہ۔اس کے بعد معاملہ
مزید آگے بڑھتا ہے والد اپنی بیٹی کی سرگرمیوں بارے تحقیق شروع کرتا ہے۔ پتہ چلتا ہے
کہ اس نے انقلابیوں کی تنظیم میں شمولیت اختیار کر کے وطن عزیز کو استعمار کے پنجوں سے
آزاد کروانے کا عزم کر لیا ہے۔"یک نہ شد دو شد" کے مصداق اب اس کی پریشانی مزید
بڑھ جاتی ہے۔وہ سوچتا ہے کہ اگر میدان جنگ میں وہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئی تو اسے بری
طرح تشدد کا نشانہ بنائیں گے یا پھر لڑائی کے دوران اگر قتل ہو گئی تو اس کی شکل وصورت
اور لاش بری طرح مسخ ہو جائے گی۔ اس خدشے کے پیش نظر والد۔۔۔خاندان کا
سربراہ۔۔۔سماجی اقدار کا علمبردار۔۔۔اپنی بیٹی کو دشمنوں کے نرغے سے بچانے کے لیے
اس کا پیچھا کرتا ہے اور خود بھی الجزائر۔۔۔آزاد الجزائر کی تشکیل کے لیے سر پر کفن باندھ لیتا
ہے۔یہاں خاص طور پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مقامی عورت نے خوشی سے نقاب
نہیں اُتارا تھا بلکہ اس کی مجبوری تھی۔جدوجہد آزادی کے آغاز میں نوآبادیاتی نظام میں
رہتے ہوئے نقاب ایک رکاوٹ بنتا تھا اور اسے دور کرنے کے لیے عورت نے اس معاشرتی
حرمت کو عارضی طور پر چھوڑ دیا لیکن جب آزادی کی تحریک اگلے مرحلے میں داخل ہوئی تو
یہی نقاب بھیس بدل کر (Camouflage) اپنے مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بن گیا۔

1957ء میں تحریک جب اپنے زوروں پر تھی یہی نقاب پھر لوٹ آیا۔معاشرتی
اقدار زندہ ہو گئیں، عورت کا احساس تنہائی اور ننگا پن جاتا رہا۔عورت نے چادر کو اپنی
چاردیواری بنا لیا۔لیکن اس کے انقلابی اقدامات میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ بلکہ وہ پہلے کی
نسبت زیادہ تیزی سے منزل کی جانب رواں دواں ہو گئی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

عورت نے دوبارہ پردہ کیوں لیا؟ استعمار کے خلاف جدوجہد آزادی میں الجزائر کے مقامی
لڑکیوں کے علاوہ خود غیر ملکیوں نے بھی حصہ لیا یہاں تک غیر ملکی خواتین نے جہادیوں کی ہر
محاذ پر دل کھول کر مدد کی۔

اب فرانسیسی انتظامیہ کو اس بات کی خبر ملی تو ان کے لیے یہ بالکل نئی صورت حال تھی
اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انہوں نے نیا شکنجہ تیار کیا۔انہیں یہ اطلاعات ان خواتین
کے ذریعہ ملی جو ان کی قید میں تھیں۔قیدی خواتین نے استعمار نواز انتظامیہ کو بتایا کہ ہماری
اس جدوجہد میں مغربی مستورات بھی شامل ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر استعماری
انتظامیہ نے ہر عورت کی تلاشی لینا شروع کر دی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی خفیہ سرگرمیوں کا
سلسلہ مزید بڑھا دیا۔استعمار کے لیے یہ خبر بڑی حیرانی اور پشیمانی کا سبب بنی کہ خود اس کا
اپنا غلام ہی اس کی تباہی کے درپے ہو گیا ہے۔یہ صورت حال جدوجہد آزادی میں ایک نیا
موڑ ثابت ہوئی۔ پولیس نے ہر آدمی کی تلاشی شروع کر دی۔ پہلے الجزائری لوگوں کو شک کی
نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اب ان کے ساتھ اپنے لوگ بھی 'مجرمانہ سازش' کے مرتکب پائے
گئے۔استعمار کی نظر میں، مقامی اور مغربی شہری برابر تصور کیے جانے لگے اور ہر اس شخص کے
لیے اپنی تلاشی دینا لازمی قرار دیا گیا جس کے پاس کوئی تھیلا یا بیگ ہو، یہاں تک کہ ان
کاغذات کا بھی جائزہ لیا جاتا جو اس تھیلے سے برآمد ہوتے۔قانونی طور پر فرانسیسی انتظامیہ
نے اس قدر سخت پابندیاں عائد کر دیں کہ ہر وہ شخص جو کوئی پارسل وغیرہ لے جا رہا ہو وہ دیگر
ساتھیوں کو بتانے کا پابند ہوتا تھا کہ یہ کہاں سے آیا ہے اور کس مقصد کے لیے وصول کیا گیا
ہے۔ ان حالات میں انقلابیوں کے لیے ضروری تھا کہ اپنے تمام پیغامات کی
ترسیل (Communication) انتہائی رازداری سے کریں۔اس موقع پر "برقعہ" ایک
رحمت ثابت ہوا جس کے ذریعے انقلابیوں کے تمام نقشوں اور کارروائیوں کی حکمت عملی
استعمار نواز پولیس سے محفوظ رہی۔

بات جب ذرا آگے بڑھی تو انقلابی عورت نے پولیس کی آنکھوں میں جھول دھونکنے کے نئے حربے استعمال کیے۔ ایک خاتون کے لیے یہ کام ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے برقع میں ایک ہاتھ سے اہم دستاویزات یا اسلحے اٹھائے اور دوسرا ہاتھ خالی رکھے۔ سیکورٹی اہلکار سمجھتے کہ اس کے سامنے سے گزرنے والی عورت بے ضرر ہے۔ اس سے کسی قسم کا کوئی خدشہ نہیں۔ اگرچہ یہ کام عملی حوالہ سے بہت مشکل تھا لیکن انقلابی عورت اس فرض کی ادائیگی میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئی۔ مثال کے طور پر ایک خاتون جب نقاب لیے بازار میں چلتی ہے تو چند گز کے فاصلے پر کھڑا سارجنٹ سمجھتا ہے کہ وہ خالی ہاتھ ہے۔ حالانکہ اس کے پاس اسلحہ یا گرنیڈ ہے جسے اس نے کسی مضبوط رسی کے ذریعے اپنے جسم کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ اس کے برعکس جب ایک عورت ضروری دستاویزات، جنگی نقشے اور خطرناک اسلحہ لیے خراماں خراماں جا رہی ہوتی ہے اس کے دونوں ہاتھ خالی نظر آتے ہیں اور چال میں کوئی ڈگمگاہٹ وغیرہ بھی نہیں جو کہ اس کے اضطراب کو واضح کرے بلکہ وہ باوقار طریقے سے ایک شریف خاتون کی طرح چلتی ہے تو اس کا یہ تاثر دشمن کے سپاہی کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔ عورت کو بے ضرر سمجھ کر لامحالہ وہ اپنا ہتھیار نیچے رکھ دے گا کیونکہ سامنے سے گزرنے والی خاتون سے اسے کوئی خطرہ نہیں۔

تحریک آزادی کا بار امانت اٹھانے سے عورت جمالیاتی حدوں سے نکل کر جلالی حدوں میں داخل ہوگئی۔ پہلے وہ اپنے حسن و جمال اپنی دلبری، رعنائی میں کمال پیدا کرنے کے درپے رہتی تھی لیکن اب اس کی طبیعت میں ایک جلال، قہاری، جبروت جیسی پُروجاہت خوبیاں پیدا ہوگئیں۔ پہلے اس کا جسم سڈول، نرم و نازک اور منبع حسن و جمال تھا لیکن اب جدوجہد کے خاردار راہوں پر چلنے سے بے ڈھنگا ہوگیا۔ اسکے پر مسلسل بندوقیں، پستول، گرنیڈ اور دیگر اسلحہ جات اٹھا اٹھا کر ورم آگئے۔

جب آزادی کے متوالوں نے اپنی جدوجہد میں کوئی کسر نہ چھوڑی تو دوسری طرف

[illegible]ے بھی ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے میں کوئی حد نہ رکھی۔ تحریک آزادی کے آغاز میں [illegible]سالوں (spy) کے غضب کا نشانہ صرف انقلابی مرد بنے۔ بعد ازاں خواتین زیر [illegible]ب آئیں، لیکن آخر یہ استعمار اس قدر بوکھلا اٹھا کہ کیا مرد کیا زن حتیٰ کہ معصوم بچوں اور [illegible]ک و پیر کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔

اس مقام پر پہنچنے کے بعد استعمار نے نیا روپ دھار لیا اور اپنی پٹاریوں میں سے [illegible]اپ نکالنے شروع کر دیے جس کا مقصد مقامی عورت کو مغربی رنگ میں رنگنا تھا۔ ان کے [illegible]یک یہی ایک طریقہ تھا کہ جو عورت کو انقلابی جدوجہد سے باز رکھ سکتا تھا۔ فرانسیسی فوجی [illegible]سروں نے اپنے گھروں میں کام کرنے والی خواتین کو ڈرایا دھمکایا کہ اگر انہوں نے انقلابیوں کا ساتھ دیا تو انہیں نذر آتش کر دیا جائے گا۔ اس طرح قحبہ خانوں میں بسنے والی [illegible]یوں کو برسر عام برہنہ کر کے گھسیٹا گیا۔ کہتے ہیں کہ ستارے ہمیشہ اندھیری راتوں میں [illegible] ہیں۔ جونہی استعمار نے انقلاب کو روکنے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع [illegible] انقلابی عورت نے بھی فوراً اپنی فطرت سلیمہ کے تحت ردعمل کا اظہار کیا اور دوبارہ برقعہ [illegible]ن لیا۔ اس طرح اس نے فرانسیسی جنرل ڈیگال کی اس دعوت کو اپنے پاؤں سے ٹھکرا دیا [illegible]س میں استعمار کے علمبرداروں نے اسے بکاؤ مال سمجھ کر اس کی بولی لگائی۔ عورت نے اپنے [illegible]ن عمل اور پختگی کردار سے ثابت کر دیا کہ وہ آزادی کے لیے اپنی جان تو دے سکتی ہے لیکن [illegible] نہیں سکتی۔

نفسیاتی حوالہ سے بھی صورت حال اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مشرقی عورت کا [illegible]ربی دعوت کو ٹھکرانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے حاکم استعمار کی اقدار کو قبول کرنے [illegible] انکار کر دیا خواہ ان اقدار کی حیثیت مغربی ثقافت کی نظر میں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ [illegible]ت یہ ہے کہ استعمار مقامی لوگوں کی نفسیات سمجھنے میں غلطی کھا گیا ہے۔ وہ ان کا مزاج [illegible]ک طریقے سے نہیں سمجھ سکا۔ اس کی خواہش ہے کہ محکوم کی ہر چیز اس کے گرد گھومے۔ اس

کے معیار حق و باطل کو من وعن قبول کرے خواہ اسے اس کی کتنی بھاری قیمت کیوں نہ دینی
پڑے۔ حالانکہ یہ رویہ اور سوچ حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ استعمار اپنی خوش فہمی
کے لیے ایسی تقریبات کا انعقاد کرتا ہے تا کہ ایک طرف مقامی لوگوں کا اس کے خلاف غم
غصہ کم ہو جائے، دوسرا یہ کہ وہ اس جال میں پھنس کر اپنی حقیقت بھلا بیٹھیں اور تیسرا یہ کہ اگر
وہ آزادی کے لئے جدوجہد کریں بھی تو سطحی نوعیت کی، نہ کہ پورے ملک میں خوف
ہراس پھیلا کر استعمار کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے درپے ہو جائیں۔

سامراج کو یہ بات مان لینی چاہیے کہ دنیا کے کام اس کے کنٹرول کے بغیر پایۂ تکمیل
تک پہنچتے ہیں۔ اس کی ہر وقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ مقامی لوگوں کو یہ باور کرائے وہ نا اہل
گنوار اور پسماندہ ملک سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے فرائض کو بہتر طریقے سے سرانجام نہیں
دے سکتے۔ اس سوچ کی نمائندگی کے لیے ہم ان الفاظ کو بطور دلیل پیش کر سکتے ہیں جو ایک
استعمار نواز رہنما نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے وقت کہی تھی کہ ''ہم پسماند
علاقوں میں قابض ہو کر وہاں کے لوگوں کو مہذب بنانا چاہتے ہیں۔ ان میں تہذیب کی روش
پھیلانا چاہتے ہیں'' ایسے ہتھکنڈوں سے استعمار مقامی لوگوں میں احساس کمتری پیدا کر
چاہتا ہے تا کہ اپنے نو آبادیاتی نظام کے بارے میں ایسی توجیہات پیش کر سکے کہ لوگ ا
کے خلاف جدوجہد آزادی کی تحریک سے باز آ جائیں اور اسے اپنا دشمن سمجھنے کے بجائے
محسن تصور کر کے اس کا اقتدار اعلیٰ قبول کر لیں۔

مندرجہ بالا استدلال سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ پردہ ایک مذہبی حکم اور ا
معاشرتی قدر تھی۔ آغاز میں یہ انقلاب کی راہ میں ایک رکاوٹ بنا۔ اس کا مقصد کسی چ
راہ میں بنیادی طور پر رکاوٹ بننا نہ تھا بلکہ اس کے مزاج میں قدامت پسندی تھی۔ اس
تاثیر میں ٹھہراؤ تھا۔ اس کا منشاء معاشرتی حسن کی تکمیل تھا جو کہ مرد و زن کو دو علیحدہ علی
دائروں میں رکھنے سے وجود میں آ سکتی تھی۔ لیکن جب استعمار نے افریقہ پر قبضہ کر

الجزائر کو ننگا کرنے کی حماقت کی تو عورت نے اس کی حفاظت کے لیے اپنا پردہ اُتار دیا اور
اپنے انقلابی بھائیوں کے ساتھ اس رزم حق و باطل میں کود پڑی تو اسی پردے نے اس کی
آزادی کی ضمانت دی۔ یہ انقلابی حکمت عملی میں ممد و معاون ثابت ہوا۔ اور اپنی آزادی کی
منزل پر پہنچ کر عورت نے پھر اپنا دامن اسی روایتی پردے سے ڈھانپ لیا۔

باب دوم

یہ ہے الجزائر کی آواز

یہ باب باندھنے کا مقصد تحریک آزادی کے ان گوشوں کو منور کرنا ہے کہ انقلابیوں نے استعمارانہ میں درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کر کے کس طرح اپنی بقا کا سامان کیا اور اس چھوٹے سے آلے جسے سائنس کی دنیا میں ریڈیو کے نام سے پکارا جاتا ہے، کیسے استعمال کیا۔ یہاں ہم بار بار دیکھیں گے کہ حاکموں کی طرف سے مقامی لوگوں پر مسلط کردہ جبر کے بعد کس طرح افتادگان خاک کے ضمیر میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔

الجزائر میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں (یہ تقریباً 1955 کی بات ہے)۔ استعمار نواز قوتوں نے ریڈیو کو اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کیا۔ اگرچہ ریڈیو اسٹیشن جدت کے نام پر الجزائر میں قائم کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ فرانسیسی استعمار ہی کی بازگشت تھا۔ اس ریڈیو نے اپنے پروگراموں اور پراپیگنڈے کے لیے جن اقدار کو فروغ دیا وہ تمام تر اسی استعماری ثقافت کا حصہ تھیں۔ الجزائر میں مقیم یورپی کمیونٹی کا شاید ہی کوئی ایسا فرد ہوگا جس کے ہاتھ میں ریڈیو سیٹ نہ ہو۔ ان میں سے اکثریت کا تعلق امراء کے طبقے سے ہے جو الجزائر پر قبضے کے بعد یہاں آئے اور پھر گاؤں اور شہروں پر قابض ہو گئے۔ اس چیز کا فرق ان کے معیار زندگی سے لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح یہ لوگ

پیداواری ذرائع پر قابض ہوئے اور مقامی لوگوں کو بے رحمی سے ان کی زمینوں اور جائیداد سے محروم کر کے در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا۔

نو آبادیاتی نظام کا شکار تقریباً ہر معاشرے میں ایک عجیب صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے کہ غریب اور پسے ہوئے طبقوں کے پاس اتنی فراوانی نہیں ہوتی کہ اپنی من پسند اشیاء سے دل بہلانے کا سامان کر سکیں۔ لیکن اسکے برعکس الجزائر میں بعض کھاتے پیتے یعنی صاحب ثروت لوگ بھی تمام تر استعداد ہونے کے باوجود اپنے وقت کی جدید ترین ایجاد یعنی یڈیو سے محروم تھے۔ یعنی معاشی طور پر ان کی حیثیت اتنی ضرور تھی کہ وہ ریڈیو خرید سکیں لیکن نہ جانے کیوں ان لوگوں نے ایسا نہ کیا۔

اعداد و شمار کے مطابق بعض ایسی مثالیں سامنے آئی ہیں کہ ان لوگوں پر قانونی طور پر ریڈیو خریدنے یا سننے میں کوئی جبر یا حرج نہ تھا۔ ماہرین عمرانیات کی سروے رپورٹوں سے یہ بات اظہر من الشّمس ہوئی ہے کہ مقامی لوگوں نے خطرناک حد تک قدامت پسند ہونے کی وجہ سے یہ قدم نہیں اٹھایا۔ جب ایک مغربی باشندے نے اپنے الجزائری ساتھی سے دریافت کیا کہ تم ریڈیو کیوں نہیں سنتے؟ تو اس نے استدلال کیا کہ یہ ایک جدید اور مغربی ٹیکنالوجی کی علامت ہے اور ہم اپنے خاندان میں بیٹھ کر اس کی نشریات نہیں سن سکتے۔ جب ریڈیو پر کوئی پروگرام نشر کیا جاتا تو پاس بیٹھے لوگ تمسخر اڑاتے اور بعض اوقات نوبت لڑائی جھگڑے پر آ جاتی۔ اس نے مزید بتایا کہ بعض اوقات خبروں کے ذریعے بیان کی گئی معاشی یا سیاسی صورت حال مختلف خاندان کے لوگوں میں ذہنی تناؤ کا سبب بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کے بغیر کاروان زندگی چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ اگر غلطی سے کسی نے ریڈیو خرید کر اس کی نشریات سننا شروع کیں اور کسی مزاحیہ پروگرام پر بہن بھائیوں کو ہنسی آ گئی تو پاس بیٹھے والد یا بڑے بھائی کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی۔ لہٰذا قدامت پسند خاندانوں نے انہی بنیادوں پر ریڈیو کو ترجیح نہ دی۔

سب سے پہلے ہمیں ریڈیو الجزائر کی نام نہاد قومی نشریات کے مطابق چلنے والے ان پروگراموں کے مزاج کا جائزہ لینا ہو گا کہ آخر وہ کون سے پروگرام تھے جن کو سن کر لوگوں کی اکثریت اعصابی تناؤ کا شکار ہو جاتی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ایک قدامت پرست معاشرے میں اپنے وقت کا جدید ترین ذریعہ برائے پیغام رسانی نصب کیا جاتا ہے تو لوگوں کے ذہن میں ایک خوف ہوتا ہے کہ کہیں ہم اپنی معاشرتی اور مذہبی روایات و اقدار سے محروم نہ ہو جائیں۔ دوسرا یہ کہ اگر مٹھی بھر لوگ جو ریڈیو خرید کر سننا شروع کرتے تو انہیں شکایت ہوتی کہ ریڈیو الجزائر کیسے پروگرام نشر کر رہا ہے کہ جن کا مقامی لوگوں کے تہذیب و تمدن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، یعنی وہ سراسر فرانسیسی استعمار کی بازگشت ہوتے تھے۔ مقامی لوگ جو جاگیردارانہ اثرات میں بڑھے پلے، اپنے والدین کے زیر سایہ جوان ہوئے، وہ اخلاقی روایات کے علمبردار ہونے کے ناطے یورپی استعمار کی نشریات سن کر کیا کرتے۔

جہاں تک براڈ کاسٹنگ یعنی خبر رسانی کا تعلق ہے تو اس میں ایک خاندان سے متعلقہ تمام مردوں اور خواتین کو یوں مخاطب کیا جاتا جیسے کہ یہ انہی سے متعلق ہے۔ ماہرین عمرانیات نے اپنے نقطہ نظر سے اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن یہاں ہم صرف عسکری حوالے سے اس بات کا جائزہ لیں گے کہ استعمار نے مقامی لوگوں میں غلط فہمی پھیلانے کے لیے ریڈیو کو کس طرح استعمال کیا۔ پہلے ہم اس بات کا جائزہ لے چکے ہیں کہ مغربی معاشرے نے کتنی سرعت سے ریڈیو کلچر کو اپنایا۔ الجزائر میں استعمار کے زیر سایہ بسنے والے شہروں میں ریڈیو جس تیزی سے پھیلا اس کا مقابلہ اگر کسی یورپی ترقی یافتہ قوم سے کریں تو کسی درجہ کم نہ ہو گا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ جس تیزی سے مغرب نے اس سائنسی رویے کو قبول کیا اسی دلجمعی سے ان کے مغربی آقاؤں نے مشرق میں جا کر اسے دل سے لگایا۔ ایک یورپی کے پاس ریڈیو کا ہونا حقیقت میں اس کے استعمارانہ کلچر کی تصدیق ہوتا ہے جو اس کے گھر سے لے کر اس کے زیر استعمال آنے والی تمام اشیاء پر محیط ہے۔

ریڈیو سننے سے مشرق میں قابض ہونے والے مغربی باشندے کو دل سے احساس ہوتا تھا کہ وہ اس کا نظام اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے، اس کی روایات، اس کے معیارات حق و باطل وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشرقی معاشرے میں مزید مستحکم ہو رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب وہ پوری طرح ایک محکوم معاشرے میں جڑیں پکڑ لیں گے۔ اس کے علاوہ ریڈیو بڑے بڑے شہروں کے آپس میں رابطے کا ایک مفید ذریعہ تھا خاص طور پر ان شہروں میں جو استعمار نے عروس البلاد (Metropolis) کے نام پر بسائے تھے۔ ریڈیو چونکہ اس دور میں اس اہمیت کا حامل تھا جو آج تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں کمپیوٹر حاصل کر چکا ہے۔ لہٰذا ایک مغربی کے لیے ریڈیو کی نشریات سننا انتہائی اہمیت رکھتا تھا۔ اسے احساس رہتا تھا کہ ہمارے نظام کو تقویت مل رہی ہے۔ دوسرا یہ کہ مشرقی معاشرے میں اسے تنہائی کا احساس نہیں ہوتا تھا بلکہ ریڈیو سننا اس کے لیے ایسے ہی تھا جیسے کہ وہ مہذب معاشرے میں قیام پذیر ہے۔

فرانسیسی فوج نے الجزائر پہ قابض ہونے کے بعد اس کے تمام پیداواری ذرائع اپنے کنٹرول میں لے لیے تھے۔ ان ظالموں نے وہاں بڑے بڑے زرعی فارم بنا لیے۔ ریڈیو سے وابستگی ایک مغربی باشندے کو احساس برتری اور احساس تحفظ فراہم کرتی تھی۔ اسے احساس ہوتا تھا کہ اس ملک میں ہمارا تسلط پوری طرح قائم ہو چکا ہے۔ ریڈیو پر فرانسیسی موسیقی کے پروگرام جذبات کو گرم رکھنے کے لیے کافی تھے۔ اس کے علاوہ مغربی اخبارات کے تراشے، حالات حاضرہ کے پروگرام الجزائر میں اس کے قبضے کی توجیہہ پیش کرتے اور اس طرح مغربی باشندہ اپنے کلچر کو مقامی ثقافت سے برتر تصور کرتا۔ مختصراً "ریڈیو الجزائر" الجزائر میں فرانسیسی استعمار کی آواز تھی۔ یہ ہر وقت اسے اپنے مرکز وفاداری سے وابستہ ہونے کی دعوت دیتی اور اسے مقامی لوگوں سے دور رہنے کی تنبیہہ کرتی۔ یہاں تک کہ دور دراز علاقوں میں قائم شدہ چیک پوسٹوں پہ فرائض سر انجام دینے والے فوجیوں، اور نئے

علاقوں کی دریافت کرنے والے رضا کاروں کے لیے ایک پیغام تھا۔ وہ ہمیشہ فخر سے کہتے کہ جس شخص کی میز پر شراب و کباب اور ریڈیو نہیں اس کا تعلق بدوؤں کے اُجڈ قبائل سے ہے۔ اسے ہماری روشن خیالی سے کوئی سروکار نہیں۔ اور یہ کہ اگر ہم ان دونوں "نعمتوں" سے محروم ہوتے تو ہمارا شمار بھی ان پسماندہ لوگوں میں ہوتا۔

1945ء میں فرانسیسی انتظامیہ نے الجزائر میں بڑے پیمانے پر لوگوں میں ریڈیو سیٹ تقسیم کیے۔ ان کے نزدیک یہ دوہرے فوائد کا حامل تھا۔ ایک طرف یہ ان لوگوں کے لیے قوت مزاحمت تھی جو اپنے آبائی وطن سے دور افریقی ملک پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے تو دوسری طرف مقامی لوگوں پر ایک ثقافتی دباؤ تھا جو انہیں ہر وقت احساس کمتری اور احساس محرومی میں مبتلا رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا۔ بڑے بڑے زرعی فارموں پر کام کرنے والوں کے لیے ایک مرکز وفاداری اور مقامی لوگوں کے لیے ہر لحظہ ایک نئی مرگ مفاجات، جن کو اپنے درخشاں ماضی سے جدا کر دیا گیا اب ان کے سامنے کوئی مستقبل نہ تھا اور نہ ان کو زندہ رکھنے والی اقدار۔ مغربی استعمار کے علمبرداروں کا مقصد مقامی آبادی کو جسمانی اور نفسیاتی طور پر احساسِ کمتری کا شکار بنانا تھا۔

اب ہم معاشرے کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں کہ مقامی لوگ ریڈیو سے محروم کیوں تھے۔ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ دیہاتیوں کا معاملہ تو ایک طرف رہا، صاحب ثروت بھی اس بات سے بیگانہ تھے۔ جب ماہرین عمرانیات نے ان لوگوں سے ریڈیو نہ رکھنے کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے اس بے بیگانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے کبھی اس کی کمی ہی محسوس نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی مغربی باشندہ مقامی لوگوں کو اس بات پر نہیں ابھارتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ مقامی لوگ اسے سنی ان سنی کر دیں گے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کوئی شخص اتنی بڑی تبدیلی سے کب تک بیگانہ اور بے نیاز رہ سکتا ہے؟

اس بات کی صداقت جاننے کے لیے ہمارے سامنے دو آراء ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے

کہ ریڈیو محض ایک سائنسی آلہ نہیں بلکہ یہ ایک قوت ہے جو بیک وقت انسان کے احساسات، جذبات، عقل و دانش اور اعصاب کو قوت بخشتی ہے۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو اس میں ذرہ بھر شک نہیں رہ جاتا کہ ''مقبوضہ الجزائر میں ریڈیو قابض استعمار کے ہاتھوں ایک تکنیک ہے اور وہ اسے اس چالاکی اور مکاری سے استعمال کرتا ہے کہ جیسے اسے مقامی شخص سے کوئی سروکار نہیں۔'' الجزائر میں ریڈیو فرانسیسی وجود کی علامت ہے، وہ ملک میں نوآبادیاتی نظام کا نمائندہ ہے جس کا مقصد ہر وقت تعمیر کے بجائے تخریب کو ہوا دینا ہے۔

اس کے علاوہ ریڈیو سے استعمار نواز انتظامیہ نے ایک اور کام لیا۔ یہ اطلاع رسانی کا ایک بہترین نظام، زبان دانی کا ذریعہ اور پیغام رسانی کا منبع ہے۔ یہاں پیغام رسانی اور اخباری تراشوں کے ذریعے نت نئے پراپیگنڈے، میوزیکل پروگرام، مزاحیہ خاکے اور نہ جانے کیسے کیسے پیغامات کو ایک خاص ترتیب سے پیش کیا جاتا ہے۔ ہر چیز، ہر تدبیر، ہر حیلے کا مقصد مقامی کلچر کو تباہ کر کے مغربی ثقافت کو غالب کرنا ہے۔ ایک دور یہ تھا کہ ریڈیو صرف انہی سرگرمیوں کے لیے مصروف عمل تھا لیکن بعد ازاں انتظامیہ کی سوچ میں ایک اور بگاڑ آیا اور انہوں نے ریڈیو الجزائر پر جنگی اور فرانس کے قومی ترانے چلانا شروع کر دیے۔ ان ترانوں کا مقصد اپنے لوگوں میں فاتحانہ جنون پیدا کرنا تھا کہ وہ استعمار کے پنجے مضبوط کرنے کے لیے مزید جدوجہد کریں۔ اس طرح ریڈیو پر ان لوگوں کو خراج تحسین پیش کیا گیا جنہوں نے الجزائر میں فرانسیسی قبضے کو ممکن بنایا۔ ان جرنیلوں کے نام دہرائے جاتے جنہوں نے ہزاروں نہتے لوگوں اور لاکھوں انقلابیوں کو موت کے گھاٹ اُتار کر الجزائر پر قبضہ کیا۔ ان پروگراموں میں ان واقعات کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا کہ کس طرح استعمار کے بانیوں نے مقامی رضا کاروں کے خون سے ہولی کھیلی۔ کس طرح آزادی کے نام پر لڑنے والوں کو خاک و خون میں نہلایا، اور کس طرح ماؤں اور بیٹیوں کی عزت کو برسرعام نیلام کیا گیا۔ اسی طرح مقامی لوگوں کو ذلیل و رسوا کرنے کے نت نئے طریقے ایجاد کیے گئے۔ مثلاً

جنرل بیجاڈ اور سارجنٹ بلانڈن کی قبروں پر گل ریزی کی تقریب کے لیے مسلمان رضا کاروں کو بلا کر مجبور کیا جاتا کہ ان ''فاتحین'' کے مزاروں پر پھول چڑھائیں۔ وجہ یہ تھی کہ ان جرنیلوں نے 1830ء میں الجزائر کو فتح کر کے استعمار کے قدموں میں پھینکا کہ اب جس طرح دل چاہے اس کو لوٹیں یہاں ایک اور دلچسپ بات ہے کہ یہ مغربی لوگ

''چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر''

کے مصداق بظاہر دکھانا نہیں چاہتے تھے کہ وہ رنگ و نسل کی بنا پر افتراک کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ''کارنامے'' اس مکاری کے ساتھ سرانجام دیے کہ کسی کو شائبہ تک نہ گزرے کہ ان سرگرمیوں کا مقصد مقامی لوگوں کو نیچا دکھانا اور احساس کمتری میں مبتلا کرنا ہے۔ المختصر ایک الجزائری باشندہ ریڈیو یہ تعریف Definition کرتا ہے کہ ''ریڈیو الجزائر'' نوآبادیاتی نظام کا ایک نمائندہ ہے۔ جنگ سے قبل مقامی لوگ مذاق سے کہتے کہ ہمیں تو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ریڈیو الجزائر کی اہمیت بس اتنی ہے کہ ایک فرانسیسی دوسرے فرانسیسیوں سے مخاطب ہے۔''

اس صورت حال کے بعد حالات نے ایک دم پلٹا کھایا۔ الجزائر میں فرانسیسی توپ خانے اور پیدل فوج نے قبائلیہ کے علاقے میں جب 45 ہزار قبائلیوں کو بغاوت کے نام پر موت کے گھاٹ اُتارا تو الجزائر کا معاملہ بین الاقوامی سطح پر آ گیا۔ سرکاری اور غیر سرکاری اخباروں نے اس بارے بڑے بڑے بلٹن شائع کیے۔ جب لوگوں نے جنگ میں ظلم و بربریت کی زندہ تصویریں دیکھیں اور اپنے بھائیوں کی مسخ شدہ لاشوں کا معائنہ کیا تو ان کے ضمیر میں ایک عجیب حرکت پیدا ہوئی۔ یہ بے چینی نہ صرف الجزائر میں ہوئی بلکہ پورا امریکہ، یورپ اور تمام افریقی ممالک میں بسنے والے قبائلیوں میں بھی دیکھنے میں آئی۔ یہ لہر اس قدر تیز تھی کہ نوآبادیاتی نظام میں بسنے والے بعض صدق و وفا کے علمبردار جن کا بظاہراً تعلق استعمار سے تھا لیکن انہوں نے خود کو آزادی کی تحریک سے منسلک کر کے مجاہدین کا ساتھ

دیا۔ یہ محرک اس قدر شدید تھا کہ سالہا سال سے غفلت میں پڑے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ مقامی لوگوں کو ریڈیو کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا۔ انہوں نے اس بارے غور وغوض کرنا شروع کر دیا۔ شام، مصر اور لبنان کی طرز پر الجزائر میں قومی نشریات کا تقاضا زور پکڑ گیا۔ 1947-48ء میں ریڈیو کے خریداروں کی تعداد میں ایک حد تک اضافہ ہوا لیکن یہ قابلِ اہمیت نہ تھا۔ جب ایک مقامی شخص ریڈیو کے ساتھ جڑا تو اس کی دلچسپی کا محور اپنے اسٹیشن کے بجائے عرب کے قومی چینل تھے جہاں عربی اور دیگر زبانوں میں پروگرام نشر کیے جاتے تھے۔ لوگ ریڈیو الجزائر کو صرف موسیقی کی حد تک پسند کرتے تھے۔ جب عام لوگوں نے ریڈیو سیٹ کی خریداری میں دلچسپی ظاہر کی تو مغربی استعمار تاجروں کی صورت میں سامنے آیا اور مارکیٹ پر قبضہ کرنے کے لیے "مقامی" نمائندوں کا انتخاب کیا۔ اور اس طرح تھوڑے عرصے میں ہر شخص ریڈیو کا مالک بن گیا۔

1952ء میں جب تیونس کے محاذ پر مجاہدین نے فرانسیسی استعمار پر کاری ضرب لگائی اور عوام الناس کی ہمدردیاں جیتنے کے لیے قومی نشریات پر بھروسہ کیا تو ہمسایہ ممالک کے اس عمل نے الجزائر کی انقلابی قیادت کو یہ بات سوچنے پر اُکسایا کہ اب ہمارے ہاں بھی قومی نشریات کا آغاز وسیع پیمانے پر ہونا چاہیے۔ واضح رہے کہ مغربی استعمار نے الجزائر کے علاوہ تیونس مراکش اور کیمرون کو بھی اپنی کالونیاں بنایا۔ تیونس نے جدوجہد آزادی کا آغاز 1952-53ء میں کیا۔ تو اس سے حوصلہ پا کر الجزائر میں نیشنل لبریشن فرنٹ "National Liberation Front" نے بھی جنگ آزادی کی تحریک شروع کر دی۔ اوّل الذکر کا میدان کارزار مشرق میں تھا جبکہ الجزائر مغربی محاذ پر دشمن سے نبرد آزما تھا۔ نتیجتاً یہ مقامی لوگوں اور خاص طور پر قیادت کی نظر میں ایک انقلابی قدم تھا۔ اس سے قیادت کی وسعت نظر اور حالات شناسی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے رویہ جات میں ایک انقلابی تبدیلی آئی انہوں نے حالات کی نزاکت کا اندازہ سائنسی بنیادوں پر لگانا شروع کیا۔ اس سارے

پروگرام کا مقصد لبریشن فرنٹ اور عوام میں رابطہ قائم کرنا تھا اور ریڈیو الجزائر اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

یہ فرانسیسی استعمار ناجائز قابضین کے ظلم وتشدد کا ردعمل تھا کہ مقامی لوگوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ ان کے ملک میں شرمناک کھیل کھیلا جا رہا ہے اور وہ اس سے آنکھیں بند کر کے مدہوش و بے خبر پڑے ہیں۔ یورپی برادری اپنی قائم کردہ نوآبادیات یعنی الجزائر میں ممکنہ خطرات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے تمام ہتھکنڈوں کو استعمال کر رہی تھی جن میں پریس، ریڈیو اور ان کے خفیہ ایجنٹ تھے جو ملک کے طول و عرض میں پھیل کر خفیہ طریقوں سے اطلاعات (Information) اکٹھی کر رہے تھے۔ مقامی باشندے نے مغربی مکاروں کی چہرہ شناسی کر لی تھی کہ وہ انہیں دیوالیہ کرنے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ اب اس کے پاس غفلت کی مزید گنجائش نہیں تھی۔ بلکہ یہ ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے گردونواح سے باخبر رہیں لیکن شروع میں یہ سوچ قومی سطح پر نہیں ابھری تھی۔ بلکہ ایک مبہم خیال کے تحت پیدا ہوئی لیکن خوشی کی بات یہ تھی کہ مقامی باشندہ اپنے سود وزیاں سے باخبر ہو گیا۔ آزادی کی تحریک نے اس کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کر دیا۔ اس کے دل میں آزادی کی تڑپ اور امنگوں نے انگڑائی لی اور اس نے اپنا فرض منصبی پہچان لیا کہ اب اپنی منزل کے حصول کے لیے اسے کوئی نہ کوئی راستہ اختیار کرنا چاہیے جہاں ارتقائی حوالے سے سفر کیا جائے۔ اس نے جان لیا کہ سفر خواہ ہزار میل کا ہو آغاز پہلے قدم سے کیا جاتا ہے۔ مقامی لوگوں کے اس جذبے کی بیداری سے قبل مغربی استعمار نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں اور اس کی یہی کوتاہی مقامی باشندے کی روشن ضمیری کا سبب بنی۔ فرانسیسی فوجیوں نے الجزائر پر قابض ہونے کے بعد وہاں ماڈل زرعی فارم بنائے جن پر مقامی لوگوں کو ملازم رکھا۔ ملازم جدید ذرائع کے استعمال میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ فرانسیسی مکاروں نے اس کے بھولے پن اور معصومیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور اسے ملک میں ہونے

والے واقعات کی غلط خبریں پہنچائیں۔ مثلاً جب کبھی مقامی شخص اپنے گورے آقا سے پوچھتا کہ صاحب کوئی نئی خبر تو گورا اپنی مکاری اور عیاری سے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیتا کہ فلاں علاقے میں باغیوں کا ایک گروہ لوگوں کو لوٹ رہا تھا فوج نے ان کے خلاف آپریشن کر کے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ یا یہ کہ بعض اوقات جب گورا دیکھتا کہ اسے اپنے مقامی ملازموں کی طرف سے اسے کسی قسم کا خطرہ ہے تو وہ انہیں روٹی کے ٹکڑوں پر زہر لگا کر کھلا دیتا اور بعد ازاں ان کا پریس اس کی تصدیق کرتا کہ فلاں علاقے میں مشتبہ دہشت گرد پولیس مقابلے میں ہلاک ہو گئے۔

جدوجہد آزادی کی ابتدا ہی سے انقلابی قیادت اس بات کی اہمیت سمجھ گئی کہ اس کے پاس قرب وجوار میں ہونے والی سرگرمیوں کے بارے میں خبر ایسے باوثوق ذرائع سے موصول ہو کہ وہ اس پر اعتبار کر سکے۔ اسے پتہ ہونا چاہیے کہ اس معرکہ حق وباطل میں ظالم سرکار کا کتنا نقصان ہوا اور تحریک آزادی کس زیاں (Loss) سے دوچار ہوئی۔ اسے اپنی زندگی انقلابی سطح پر لانا پڑی۔ اسے اطلاعات ونشریات کے ایسے وسیع دائرے میں داخل ہونا پڑا جہاں وہ حقائق جان سکے، جہاں حاکم ومحکوم کے درمیان ہونے والی کشمکش کا اندازہ لگا سکے۔ اس طرح جنگ آزادی جو اس کے اپنے لوگوں نے شروع کی، اس کے لیے یہ ممکن ہوا یہ ایک زندہ اور متحرک کمیونٹی (Community) کا حصہ بن سکے۔ اب اس کے سامنے کھلا منظر تھا۔ اسے بیک وقت فرانسیسی اور اپنے قومی ذرائع سے خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ مغربی میڈیا اس کے سامنے بے نقاب ہو گیا۔ اس کا جھوٹ کھل کر سامنے آ گیا جو اس نے جدید ذرائع کو آلہ کار بنا کر بولا تھا۔ اس کا مقصد مقامی لوگوں کو اپنے نفع نقصان سے بے خبر رکھنا تھا۔

استعماری پریس، ریڈیو جس کے بارے میں مقامی باشندے کو بتایا گیا کہ وہ اطلاعات ونشریات کے ذرائع ہیں، اب اس پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ان کی حیثیت جھوٹ

کے پلندے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اپنے انقلابی ریڈیو الجزائر نے اسے فرانسیسی استعمار کے مقابلے لا کھڑا کیا جس نے اپنی مکاری، عیاری اور سفاکی کے ذریعے ہر مقامی رسم وروایت، اقدار اور جذبوں کی نفی کی۔ وہ حقیقت سے آشنائی کے بعد سچ کی دنیا میں داخل ہو گیا۔ مختصر یہ کہ فرانسیسی استعمار کے مقابلے میں الجزائری ردعمل افتادگان خاک اور پسے ہوئے لوگوں کا انکار تھا، مغربی تہذیب کا انکار۔۔۔ اس کی اقدار کا انکار۔۔۔ اس کے معیار کا انکار۔۔۔ اس کے حربوں اور چالاکیوں کا انکار۔۔۔ بذات خود استعمار کے وجود کا انکار۔۔۔ اس طرح ظالم اور غاصب حکمرانوں کا جھوٹ مقامی لوگوں کے لیے سچائی کا دروازہ ثابت ہوا یعنی استعماری ریڈیو نے اپنی نشریات میں حقیقت کو مسخ کیا جس سے مقامی لوگوں میں بے چینی بڑھی اور یہ اضطراب انہیں حق وصداقت تک پہنچانے کا سبب بنا۔

جنگ آزادی کے آغاز میں ریڈیو اور اخبارات نے بہت مثالی کردار ادا کیا۔ لوگوں کو بروقت تمام مصدقہ حقائق سے خبردار کیا۔ لوگوں کو یہ جان خوشی ہوئی کہ مختلف محاذوں پر ہونے والی کارروائیوں کے بارے میں اطلاعات من وعن ان تک پہنچ رہی ہیں۔ مقامی شخص میڈیا کی قوم پرستانہ، آزاد خیالی اور استعمار دشمن پالیسیوں سے پوری طرح مطمئن تھا۔ اس طرح خبروں کی دنیا میں ایک توازن قائم ہو گیا۔ یعنی پہلے خبر رسانی کا ذریعہ صرف یورپی ریڈیو تھا جو حقائق کو مسخ کر کے خبر بھیجتا تھا۔ اب مقابلے میں مقامی میڈیا لوگوں کے حقوق اور آزادی کا علمبردار بن کر سامنے آ گیا جس سے پریس کی دنیا میں توازن قائم ہوا۔ لوکل پریس لگنے سے پہلے بھی الجزائر کے لوگوں تک خبریں پہنچتی تھیں۔ جب وہ سنتے کہ فلاں علاقے میں مجاہدین کا مقابلہ سیکورٹی فورسز سے ہوا تو مقامی باشندہ محض اپنے جذبوں کے بل بوتے پہ اسے قبول کرنے سے انکار کرتا اور بعض اوقات بکواس سمجھ کر رد کر دیتا کہ فرانسیسی ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے موصول ہونے والی خبروں کی حقیقت جھوٹ کے سوا کچھ نہیں لیکن اب صورت حال تبدیل ہو گئی۔

اگلے مرحلے میں عجیب صورت حال پیدا ہوئی۔ مقامی میڈیا جس صداقت اور غیر جانبداری۔ Neutrality سے خبررسانی کررہا تھا اس نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہی میڈیا جو اپنی نیک نامی کی وجہ سے حق آزادی اور ضمیر کی آواز بن کر ابھرا تھا اب اس نے اپنے اوپر خود ہی چند پابندیاں عائد کرلیں جس سے لوگوں میں بے چینی اور اضطراب بڑھ گیا۔ انہیں احساس ہوا کہ کوئی چیز ان سے چھپائی جارہی ہے۔ جب وہ ملک میں ہونے والے حقائق وواقعات پر نظر ڈالتے اور میڈیا میں اس کے بارے میں متضاد رویہ پاتے تو بے چین ہو جاتے۔ مگر ایجادات کی بے چینی مایوسی میں بدلنے لگی۔ قومی پریس اور میڈیا کے علاوہ ان کے پاس کوئی دوسرا باوثوق ذریعہ نہ تھا جس سے حقائق کی صداقت جان سکتے اپنے اردگرد ہونے والے واقعات کی صحت پرکھ سکتے۔

فرانسیسیوں نے انقلابیوں کی تمام سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ لگایا اور ان کے ذہن میں یہ گمان گزرا کہ انقلابی کسی قیمت پر تحریک آزادی کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کرسکیں گے لیکن صورت حال اس سے بالکل مختلف ہوگئی۔ جب انقلابی دستوں نے یکے بعد دیگرے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کرنا شروع کردیا۔ اس سے مغربیوں کے ذہن میں یہ بات آئی کہ انقلابی دستے فرانسیسی افواج سے کس درجہ کم نہیں۔ مجاہدین کی کارروائیاں اس قدر موثر تھیں اور ان کی طرف سے کی گئی ہر جارحیت کارگر ثابت ہوئی۔ فرانسیسی ٹینکوں کو چپے چپے پر گوریلا مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا کوئی جہاز پوری آزادی اور بے باکی کے ساتھ حملہ آور ہونے سے گریز کرتا تھا۔ اسے خدشہ رہتا کہ وہ کسی وقت بھی مجاہدین کے ہتھیاروں کی زد میں آسکتا ہے۔ فرانسیسیوں کو تحریک آزادی کے پہلے سال اگرچہ شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہیں اس بات کا یقین تھا کہ الجزائر میں ابھی ان کے قائم کردہ استعمارانہ نظام (Colonial System) کو کوئی خطرہ نہیں۔ یہاں ان کا مستقبل روشن ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میڈیا فرانسیسی استعمار کے حق میں مبالغہ آرائی کی حد تک افواہیں پھیلاتا کہ ابھی

تمام الجزائر ان کے قبضے میں ہے۔ انقلابیوں کو طرح طرح کے القاب دے کر بدنام کیا جاتا۔ کبھی انہیں باغی اور کبھی فسادی کہا جاتا۔ اس کے برعکس جہاں تک دور دراز کے علاقوں کا تعلق تھا وہاں دیہاتی لوگوں کو خاصی تکالیف اور ذہنی کوفت کا سامنا تھا کیونکہ ان کے پاس مسخ شدہ خبریں پہنچتی جو ان کے لیے مایوسی کا سبب بنتیں۔

پھر حالات نے ایک دم پلٹا کھایا۔ 1955ء کے شروع میں افواہیں پھیلنا شروع ہوگئیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے شہر جن پر استعمار کا قبضہ تھا ان کے ہاتھ ایک ایک کرکے نکل رہے ہیں اور جہادی گروپ ان پر قابض ہورہے ہیں۔ اور یہ کہ ان شہروں پر الجزائر کے جھنڈے لہرادیے گئے ہیں۔ بفرض محال اگر لوگوں کو قوم پرستوں کی کامیابیوں کا یقین نہ ہوتا تو وہ قریبی شہروں میں فون کرکے انقلابیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں تصدیق کرتے کہ مجاہدین کے بارے میں جو کامیابی کی خبریں موصول ہورہی ہیں وہ سچ ہیں یا محض افواہیں فرانسیسی سامراج اس صورت حال سے چوکنا ہوگیا کہ اپنے ظالمانہ نظام کی بنا پر اس نے جو جال بنے تھے وہ منتشر ہورہے ہیں۔

فرانسیسی قبضے کے خلاف بغاوت شروع ہونے سے قبل حالات بالکل درست تھے۔ زندگی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ بازاروں میں چہل پہل، وہ تجارتی مراکز میں ریل پیل، وہی انتظامی امور کی ہلچل، لیکن 1954ء کے بعد جب لبریشن فرنٹ نے اپنی انقلابی سرگرمیوں کا آغاز کیا تو حاکموں پر یہ بات عیاں ہوگئی کہ زندگی اپنی ڈگر سے مسلسل ہٹ رہی ہے۔ فرانسیسی شہری اس دوران ذہنی طور پر تذبذب کا شکار تھے کہ ان کے آقا ان سے کوئی چیز چھپا رہے ہیں۔ حقیقتاً استعمار نواز حاکم اسے مسلسل پوشیدہ رکھ کر اپنی بقا کی جنگ لڑنا چاہ رہے ہیں۔

عمرانی (Sociological) حوالے سے یہ بات قابل غور ہے کہ الجزائر کے باسیوں نے اپنی غیر ذمہ داری چھوڑ کر سائنسی اقدار کو تسلیم کرلیا اور وہ ٹیلی فون جو آج تک

ان کی لاپرواہی کی بھینٹ چڑھ رہا، اچانک ان کی التفات نظر کا مرکز بن گیا۔ اس نے عوام میں اس قدر رواج حاصل کیا کہ فرانسیسی عربوں کے بارے میں صرف ٹیلی فون کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ اسے ''عرب ٹیلی فون'' کا نام دیتے کیونکہ اس کے ذریعے ایک شخص اپنے رشتہ داروں کو حقائق سے باخبر کرتا رہتا۔ اور ایک شخص کے منہ سے نکلنے والے الفاظ بجلی کی سرعت سے دور دراز شہروں تک پہنچ جاتے۔ یہ طریقہ صاف اور محفوظ نہیں تھا بلکہ خفیہ پولیس اور سراغرساں ایجنسیوں کے ایجنٹ ان فون کالز کا سراغ لگا لیتے۔ لیکن 1955ء میں صورت حال بالکل تبدیل ہو گئی یعنی ریڈیو کی لہروں کے ذریعے ایک پیغام محفوظ بھی رہتا، عام آدمی اس کی زد میں بھی نہ آتا اور ویسے بھی یہ پیغام ملک کے دور دراز علاقوں میں پہنچ جاتا۔ اس ایک عام آدمی اور انقلابی قیادت میں جو خلا تھا وہ پُر ہو گیا۔ پہاڑوں میں بسنے والا ایک گڈریا بھی ریڈیو کی مدد سے ملک کے سیاسی اور انقلابی ایوانوں میں ہونے والی سرگرمیوں سے آگاہ رہ سکتا تھا۔

اس ریڈیو کا کمال تھا کہ جب عام آدمی قومی نشریات کے ذریعے پروگرام سنتا تو اس میں استعمار کے خلاف عجیب قسم کا جنون پیدا ہو جاتا اور وہ ننگی تلواریں اور خنجر لے کر کوچہ و بازار میں کھلے عام لیا پھرتا۔ آزادی زندہ باد، الجزائر زندہ باد کے نعرے اس کی زبان پر گونجتے۔ ان انقلابیوں کو منتشر کرنے کے لیے پولیس کے گشتی دستے ان پر فائرنگ کرتے اور جو کوئی زخموں سے دوچار ہو جاتا تو ہسپتال میں موت کی کشمکش کے دوران بھی اس کے منہ سے مایوسی کے بجائے آزادی کے نعرے نکلتے۔ ماہرین نفسیات نے بتایا کہ ان لوگوں کے دل و دماغ میں آزادی کی محبت اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ یہ لوگ اس کے عشق میں موت کو ہنس کر گلے لگا لیتے ہیں۔ بعض زخمیوں کی یہ حالت تھی کہ عینی شاہدین نے ان کے منہ سے یہ لفظ سنے ''گو کہ ہم اس آزادی کی راہ میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں لیکن ہم کمزور نہیں ہیں۔ ہمارے ساتھی پیچھے آ رہے ہیں وہ ظالموں سے پنجہ آزمائی کر کے ان پر غلبہ پا لیں گے

اور اپنے عزیز کو آزاد کروا کے دم لیں گے۔'' وغیرہ۔

اس سے بڑھ کر استعمار نے ظلم کا نیا راستہ اختیار کیا کہ جو لوگ محض شک کی بنا پر گرفتار کیے جاتے پہلے تو ان سے خفیہ راز اگلوانے کے لیے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا اور انکار پر انہیں بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا۔ لیکن بعد ازاں مغربی میڈیا انتہائی مکاری اور عیاری سے کہتا کہ ان لوگوں نے قید خانے سے فرار ہو کر باغیوں کے گروہ سے ملنے کی کوشش کی جس کی پاداش میں وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ حالانکہ اس کی حقیقت جھوٹے پراپیگنڈے کے سوا کچھ نہ ہوتی۔

بہرحال الجزائر کو ایک ایسے فضائی نیٹ ورک سے منسلک کر دیا گیا کہ شہریوں کا اپنے اعلیٰ کمان سے مسلسل رابطہ رکھتا۔ پل پل کی خبر ان تک پہنچتی اور انہیں فوج کے استعمال میں آنے والے ساز و سامان اور اسلحے سے آگاہ کیا جاتا۔ یہ چیز ان کے لیے حد درجہ اطمینان کا سبب بنتی۔ یہاں تک کہ اگر ایک ریڈیو سننے والا خط کے ذریعے فرمائش کرتا تو اسے مجاہدین کے آپریشن کے بارے میں آگاہ کر دیا جاتا اور یہ خبر روز روشن کی طرح واضح اور سچی ہوتی لیکن اصل ذریعے (Source) کا ذرہ بھر بھید نہ کھلتا۔ جب حق و باطل کے معرکے ہوتے، میدان سجتے تو ایک عام شہری کو لڑائی میں ہونے والے نقصان کا ایک حد تک اندازہ ہو جاتا۔

اس کے علاوہ اخباروں کی دنیا میں عجیب کشمکش دیکھنے میں آئی۔ جب جنگ آزادی اپنے عروج پر تھی تو اس وقت ریڈیو کے علاوہ اخبارات بھی اطلاعات کا ذریعہ تھے۔ یہ دو زبانوں میں شائع کیے جاتے۔ ایک مقامی یعنی عربی اور دوسرے فرانسیسی لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ یہ براہ راست فرانس سے درآمد کیے جاتے۔ مغرب چونکہ سائنسی حوالے سے ترقی یافتہ تھا اس سلسلے ان کے اخبارات جب مارکیٹ میں آئے تو عوام انہیں ہاتھوں ہاتھ خریدتے تا کہ محاذ جنگ پر ہونے والی صورت حال سے آگاہ ہو سکیں لیکن عوام اصل

حقیقت سے بے خبر تھے کہ آیا مغربی پریس اصل واقعات کو بیان کرتا ہے۔ اس کا تو مقصد ہی سامراجی یلغار کا پرچار کرنا ہے۔ لبریشن فرنٹ پر بہت جلد یہ حقیقت بھی عیاں ہوگئی کہ ان اخبارات کی فروخت کا براہ راست فائدہ فرانسیسی استعمار کو ہو رہا ہے، لہٰذا انہوں نے مقامی مالکوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے مقامی پریس کو ترقی دیں۔ مالکان نے انقلابی قیادت کی آواز پر لبیک کرتے ہوئے فوراً مقابلہ بازی شروع کردی اور مقامی اخبارات بڑی تعداد میں بازار میں بکنا شروع ہوگئے۔ اس دوران اخبار بیچنے والوں کے جذبات بھی فراموش نہیں کیے جاسکتے ہیں جنہوں نے غیر ملکی اخبار کے بجائے صرف مقامی اخبار بیچنے کو ترجیح دی۔ اس طرح فرانسیسی اخبارات کی سرکولیشن خطرناک حد تک کم ہوگئی۔

استعمار بھی اپنی مکارانہ چالوں میں کب کمی آنے دیتا ہے اس نے فوری طور پر نئے قوانین اور ضابطوں کے تحت قومی اخبارات کے حقوق (Declaration) ضبط کرنا شروع کردیے اور نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ جب سرکار کے ایجنٹ مارکیٹ سے اخبار غائب کردیتے تو وہاں اپنے نمائندے بیٹھا دیتے۔ اگر کوئی قومی اخبار کا مطالبہ کرتا تو اسے یہ کہہ کر ٹرخا دیا جاتا کہ فلاں اخبار مارکیٹ میں آنا بند ہوگیا ہے کیونکہ جب کوئی شخص قومی اخبار کا پوچھتا تو استعمار نواز ڈیلر کی نظر میں گاہک کا مطالبہ قوم پرستی کی علامت سمجھا جاتا جو کہ براہ راست جنگ کے مترادف تھی۔ الجزائر کے شہریوں نے اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نئی ترکیب نکالی کہ جب صبح ہوتی تو وہ خود مارکیٹ جانے کی بجائے نابالغ بچوں کو اخبار خریدنے کے لیے بازار بھیج دیتے۔ یہ سلسلہ چند روز تک جاری رہا اور پھر اخبار فروش مجاہدین کے اس حربے سے بھی واقف ہوگئے اور انہوں نے بچوں کے ہاتھ اخبار فروخت کرنے سے انکار کردیا۔ اب اگر کوئی شخص خواہ بچہ ہو یا بوڑھا اگر وہ فرانسیسی اخبار L, Express, L Humanitic اور Libration نامی اخبار لینے جاتا تو اسے ناکامی کا

سامنا کرنا پڑتا۔ اُدھر سیاسی ڈائریکٹوریٹ کے انقلابی ونگ نے تمام مقامی اخبارات کے بائیکاٹ کا حکم دے دیا۔ اس فیصلے کے دو مقاصد تھے ایک یہ کہ جارحانہ پالیسیوں کے ذریعے ان کے معاشی مفادات کا تحفظ کرنا اور دوسرا مقامی پریس پر پابندی عائد کرکے اُسے یہ باور کرانا کہ وہ عوامی نقطۂ نظر سے کس اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے برعکس سیاسی ڈائریکٹوریٹ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ اگر مقامی پریس پر پابندی عائد کردی گئی تو لوگوں کو فرانسیسی پریس کے شائع کردہ اخباروں پر انحصار کرنا پڑے گا۔ اور وہ اپنی عیارانہ فطرت کے [illegible] مار دھاڑ والی مایوس کن خبروں اور تصاویر کو اپنے اخباری صفحات کی زینت بنائیں گے عوام الناس میں مایوسی اور قنوطیت پھیلانے کے سوا کچھ نہیں۔

جب تک عوام الناس پریس سے بے خبر تھے تب تک وہ جنگ سے بھی بے بہرہ تھے۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا کہ ان کے ملک میں خاک وخون کا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور نہ ہی وہ جنگ آزادی کے فیوض و برکات سے بہرہ مند تھے۔ انقلابی قیادت نے اس مسئلے کو بھی اپنی دور اندیشی سے حل کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ آزادی کے سال اوّل کے دوران اگرچہ لوگوں نے پریس کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کردی لیکن وہ تمام اخبارات تقریباً فرانسیسی زبان میں تھے مثلاً L, Express, L echo,d alger اور جب تازہ ترین صورت حال جاننے کی کوشش کرتے تو اپنے سامنے فرانسیسی زبان کو پاتے اس سے ان کو یہ احساس ہوتا کہ ابھی تک استعمار کا وجود قائم ہے۔

مقامی لوگوں کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات کیا ہوسکتی تھی کہ جب وہ الجزائر کے بارے میں ایک ایسے ذریعے سے خبریں سنتے جو غیر ملکی نہیں بلکہ ان کا اپنا تھا، ریڈیو الجزائر۔ ریڈیو کو وقت کے جدید خطوط پر استوار کیا گیا، خاص طور پر عرب ممالک میں ان کے نمائندے مقرر کیے گئے جو روزانہ عوام الناس کو آزادی الجزائر کی تحریک میں ہونے والی پیش رفت سے آگاہ کرتے۔ اسی طرح مقامی لوگ اپنے قائدین کی حکمت عملی جان کر خوشی

سے باغ باغ ہو جاتے۔ مصر، تیونس، مراکش اور دیگر مسلم ممالک میں جانے والے لوگ، صبح
وشام ریڈیو کو اپنے مفید مشوروں سے ہمکنار کرنے کے لیے خط وکتابت کا سلسلہ جاری
رکھتے جو کہ ریڈیو نشریات کی افادیت بڑھانے کے لیے مزید مفید ثابت ہوا۔

عوام الناس میں عصر حاضر کے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لیے جو ریڈیو خریدنے کا
جذبہ پیدا ہوا وہ جوں کا توں رہا، اس میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ دور دراز علاقوں کے باسیوں
نے بھی حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کے لیے ریڈیو سیٹ خرید لیے۔ جونہی تحریک آزادی
1956ء میں داخل ہوئی۔ ریڈیو الجزائر میں ایک اور انقلابی تبدیلی لائی گئی۔ پہلے جو نظام
(Short waves) کی وجہ سے محدود پیمانے پر اپنی خدمات سرانجام دے رہا تھا بعد ازاں
اسے (Long Waves) کے ساتھ منسلک کر دیا گیا اور اس طرح براڈ کاسٹنگ یعنی خبروں
کی نشریات میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ پہلے ریڈیو الجزائر وسائل کی کمی کی وجہ سے صرف
دوبار خبریں دیتا تھا، اب یہ سلسلہ دو سے بڑھا کر زیادہ مرتبہ کر دیا گیا۔ زمینی فاصلے
سمندروں اور دریاؤں کی پنہائی، پہاڑوں کی اونچائی ان خلائی لہروں کے راستے ہی حائل
نہیں ہوتی تھیں۔ اب بلا امتیاز رنگ ونسل ہر شہری ریڈیو سروس کی نشریات سے بھرپو
استفادہ کر سکتا ہے۔ اس دوران ریڈیو کی خریداری اس گراف سے ہوئی کہ بیس دنوں کے
اندر جتنا ذخیرہ مارکیٹوں میں پڑا تھا اچانک غائب ہو گیا۔ اب استعمال شدہ Second
(Hand) ریڈیوز کی خرید وفروخت شروع ہوگئی۔ وہ لوگ جو فرانسیسی ریڈیو کے محکمے میں اپ
فرائض سرانجام دے رہے تھے انہوں نے دکانیں کھول لیں۔ نئے ریڈیو نہ سہی، لوگوں
پرانے سیٹ خریدنے کو ترجیح دی۔ پھر اس کے علاوہ وہ علاقے جہاں ابھی بجل
(Electricity) کی سہولت نہیں پہنچی تھی ان لوگوں کے لیے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔
ریڈیو خرید بھی لیتے تو اس کا کیا کرتے۔ لیکن جذبے اگر سچے ہوں تو نیا راستہ نکال
مشکلات پر قابو پا لیتے ہیں۔ لوگوں نے سوچا کہ بجلی نہ سہی بیٹری (Battery) سسٹم تو موج

اور اس کے ذریعے ریڈیو سروس سے بخوبی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح لوگوں میں
ریوں کی سہولت کے پیش نظر ریڈیو خریدنے کا شوق مزید بڑھ گیا۔ الجزائر میں انفرادی اور
اعی سطح پر ہر شخص کے پاس ریڈیو کی سہولت موجود تھی۔ خاندان خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا
ب، ریڈیو سیٹ اس کی ملکیت بن گیا۔ جب خبروں کا وقت ہوتا پورا خاندان الرٹ
ہو جاتا، کیا ماں کیا بیٹا، حتیٰ کہ والد اور بیٹی شانہ بشانہ بیٹھ کر ریڈیو نشریات سے محظوظ ہوتے
اور سرحدی علاقوں میں استعمار کے خلاف ہونے والی دوبدو لڑائی کے بارے میں جان کر
اطمینان پاتے۔

ریڈیو خریدنا صرف ایک جدید آلے کا استعمال ہی نہیں رہا بلکہ اس کی حیثیت اس سے
کہیں بڑھ گئی تھی۔ یہ سمجھا جانے لگا کہ ریڈیو رکھنے والے شخص اور خاندان نے اپنے آپ کو
انقلابی صفوں میں شامل کر لیا ہے اور اپنی بقا کے لیے سائنسی دریافتوں اور ایجادات کے
استعمال کی اہمیت اس پر پوری طرح منکشف ہو چکی ہے۔ یہاں اس معاشرے کی تخلیقی
صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طریقے سے انہوں نے ایک پسماندہ
معاشرے کو جدید ترین ایجاد کے استعمال پر آمادہ کر لیا اور اس دوران پیش آنے والی تمام
کمزوریوں اور محرومیوں پہ بخوبی قابو پا لیا۔ انقلابی قیادت عوام کے ذہن میں یہ بات ڈالنے
میں کامیاب ہوگئی کہ ریڈیو سیٹ بذات خود ایک مقصد نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ
ہے۔ اس کے ذریعے عام شخص اور اعلیٰ قیادت کے درمیان فاصلے کو مٹانا ہے اور جب کسی
معاشرے میں عام شہری اور قیادت میں فکری فرق مٹ جاتا ہے تو یہ انقلاب پیش خیمہ ثابت
ہوتا ہے۔ فرانسیسی استعمار اس انقلابی اقدام کے آغاز میں بالکل بے خبر رہا کہ ریڈیو لوگوں
کی زندگی میں کس طرح کی تبدیلیاں لا رہا ہے کہ گھر میں ایک چھت کے تلے پورا خاندان
ریڈیو الجزائر کی خبروں کا منتظر نظر آ رہا ہے۔ خبروں کے علاوہ ریڈیو پر عوامی دلچسپی کے کئی
پروگرام چلائے گئے جن کے ذریعے حکمرانوں پہ عجیب طرح کی پھبتیاں کس جاتیں اور

انہیں اشارے کنایے کی زبان میں تضحیک وتذلیل کا نشانہ بنایا جاتا۔ اب ریڈیو غیر ملکی ایجاد
نہیں رہا، اسے صرف دشمن کی ملکیت تصور نہیں کیا جاتا بلکہ الجزائری شہری اس حقیقت سے
آشنا ہو گئے کہ ریڈیو بیرونی یا مقامی چیز نہیں ہے، یہ صرف ایک سائنسی آلہ ہے جسے کسی بھی
مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اگر استعمار اسے اپنے مفہوم مقاصد کی تکمیل کے لیے
استعمال کرسکتا ہے تو آزادی کے علمبردار سے اپنی آزادی استقلال کے لیے کیوں نہیں
استعمال کرسکتے۔ یہ بات فکری حوالے سے ایک بہت بڑا اقدام تھا۔

کسی قوم کی سب سے بڑی خوش بختی اس کی وحدت ہوتی ہے جس کے بل بوتے پر وہ
بڑے سے بڑے طوفان کا بآسانی مقابلہ کرلیتی ہے۔ الجزائر میں ریڈیو کی آمد سے قبل
معاشرہ فرقوں میں بٹا ہوا تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کا ذمہ دار بھی استعمار ہی تھا جس نے
"لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کے تحت لوگوں کے دلوں میں نفرت کا زہر بھر دیا۔ بہرحال
معاشرے میں نسلی لسانی اور خاص طور پر مذہبی تفریق پائی جاتی تھی، ریڈیو نشریات سے تمام
فاصلے مٹ گئے، سب نفرتیں دور ہوگئی، کدورتیں دم توڑ گئیں، بھائی بھائی سے مل گیا،
خاندان خاندان سے منسلک ہوگیا، برادریاں اور اسی طرح پورا ملک وحدت کی رسی میں
پرودیا گیا۔ اس کا کریڈٹ ریڈیو کو جاتا ہے جس نے اپنی انسان دوست، مذہبی، روشن فکر اور
عالمگیر تعلیمات کی بنا پر اپنا مشن شروع کیا۔ اور اس صدق وسچائی، شعور آگہی اور معرکہ آرائی
میں اسے بڑی حد تک کامیابی بھی ملی۔ اب پریس کے صفحوں پر چھپی تصاویر اور اداراتی صفحوں
میں کیے گئے جھوٹے پراپیگنڈے لوگوں کے دل ودماغ پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ لوگوں
کے دل میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ ہمارا رابطہ انقلابی قیادت سے قائم ہوگیا۔ ہمیں اپنی زبان و
ادب میں تمام حقائق سے آگہی ہو رہی ہے۔ لوگوں کا سیاسی اور انقلابی قیادت پر پختہ یقین
ہوگیا کہ وہ لوگ صرف اور صرف ہماری بقا کے لیے باطل سے پنجہ آزمائی کر رہے ہیں۔ اس
تمام تر جدوجہد کا مقصد ان کی نظر میں آزادی اور صرف آزادی کا حصول تھا جس سے محروم

لے کے بعد ان کی تمام تر جمالیاتی اور جلالی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں۔ یہ لوگ کشمکش کے
اور یہ اپنی آزادی، دلبری اور رعنائی کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو من
حیث القوم ان کی پہچان تھی۔ یعنی قومی آزادی...... لوگوں کی حکومت...... ان کی اپنی حکومت
داخلی اقتدار...... خارجی اقتدار...... حقیقی اقتدار۔

یہاں یہ بات غیر ضروری نہیں کہ بیرونی آقاؤں کا مقصد صرف لوگوں کی سیاسی
آزادی سلب کرنا نہیں ہوتا بلکہ انہیں معاشی آزادی سے بھی محروم کرنا ہوتا ہے۔ الجزائر
میں ریڈیو کی انقلابی تحریک سے ایک یہ تاثر بھی ابھر کر سامنے آیا کہ لوگ اپنے آپ کو
معاشی طور پر آزاد تصور کرنے لگے۔ اگرچہ مکمل طور پر نہ سہی جزوی (Partial) حد تک ہی
تھی۔ ریڈیو سیٹ کے حامل شخص کو اس کے عوض ہلکا سا محاصل (Tax) دینا ہوتا تھا اور وہ
فرانسیسیوں کے بجائے خود انقلابی قیادت کے کھاتے میں جمع ہوتا اور یہ اس حوالے سے
بہت اہم اقدام تھا۔

فرانسیسی انتظامیہ جو تحریک آزادی کے ابتدائی ایام میں ریڈیو کی اہمیت سے پوری
طرح واقف نہیں تھی، اب اسے اس کی افادیت کا ایک حد تک اندازہ ہوگیا کہ الجزائری
شہری ہر لمحے انقلابی قیادت کی کارروائیوں سے آگاہ ہو رہے ہیں اور یہ چیز ان کا حوصلہ
بڑھانے میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔ مغربی آقا کب اسے برداشت کرسکتے تھے۔
فرانسیسی انتظامیہ اس انقلابی تبدیلی کی روک تھام کے لیے حرکت میں آ گئی۔ ظالم استعمار
کے ہاتھ میں اس سے بڑھ کر اور کون سا ہتھیار ہوسکتا ہے کہ جس چیز کو اپنی بقا اور استحکام کے
لیے مضر خیال کرے، قانون کی آڑ لے کر پہلے اسے مضر اور بعد میں غیر قانونی قرار
دے دے۔

ریڈیو کی خرید وفروخت کے معاملے میں بھی استعمار نے یہی ہتھکنڈا استعمال کیا۔ پہلے
تو اس کی فروخت (Sale) پر پابندی عائد کی گئی۔ لیکن جب دل نہ بھرا تو شہریوں پر ظلم وتشدد

کے لیے نئے بہانے ڈھونڈ لیے۔ ریڈیو کے حصول کے لیے ایک خاص طریقہ وضع کیا گیا جو
سرکار کے ایوانوں سے جاری ہوتا تھا۔ یعنی آپ کو ریڈیو حاصل کرنے کے لیے پہلے ایک
رسید (Voucher) حاصل کرنی پڑتی تھی جسے متعلقہ ملٹری سیکورٹی یا پولیس انتظامیہ جاری
(Issue) کرتی۔ اس کے علاوہ استعمار نے مزید مہربانی کی کہ ریڈیو کو چلانے والی بیٹریوں
کی خرید وفروخت پر مکمل پابندی عائد کردی اور مارکیٹ میں پہلے سے موجود تمام بیٹریاں
غائب کردیں۔ اب مقامی ڈیلروں کے سر پر ایک اور کڑا امتحان آن پڑا۔ یہ ان کی حب
الوطنی کا امتحان تھا۔ سوال یہ تھا کہ وہ استعمار کے اس حربے کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہیں یا
اپنی قوت ارادی اور کمال فراست سے کوئی متبادل راستہ نکالنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔
رکاوٹ اپنی جگہ سہی لیکن شہریوں کے لیے ریڈیو اور زندگی لازم وملزوم ہو چکے تھے۔ اس کے
بغیر رہنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس آلہ نے ان کو اعلیٰ قیادت کے فیصلوں سے آگاہ کیا۔ وہ
محاذ جنگ پر ہونے والی ہر آن کے بارے میں باخبر رہنے کو اپنے لیے سعادت سمجھتے۔
بصورت دیگر ان کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوجاتا۔ المختصر ریڈیو کا ہونا، نہ ہونا ان
کیلئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔

استعمار جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں پہلے ہی مقامی لوگوں اور انتظامیہ پر
سبقت رکھتا تھا۔ اسے ماضی قریب میں لڑی جانے والی عالمی جنگوں میں دشمن کے ریڈیو
سسٹم مفلوج (Jam) کرنے کا اچھا خاصا تجربہ تھا اور اس نے یہ تجربہ الجزائر میں بھی
آزمایا۔ پہلے اس نے اپنے جدید ترین سراغ رساں سائنسی آلات کے ذریعے ریڈیو الجزائر کا
پتہ لگایا اور بعد ازاں اس کو مکمل طور پر جام کردیا۔ اب لوگ ریڈیو الجزائر کی نشریات سننے
سے عاجز آگئے۔

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے ہم

کے مصداق انقلابی قیادت کے لیے ایک اور مسئلہ پیدا ہوگیا۔ کہ اس صورت حال سے عہدہ

برآ ہونے کے لیے کیا حربہ اختیار کیا جائے اس بات کو 24 گھنٹے گزر گئے۔ لوگوں نے خبروں
کے وقت اپنے ریڈیو سیٹ آن کیے تو انہیں گونگا پایا۔ سوئی اِدھر اُدھر گھمائی کہ شاید کسی اور جگہ
سے کوئی ان دریافت ہو سکے۔ لیکن ہر دفعہ منہ کی کھانا پڑی۔ کوئی محدود پیمانے (Short
Wave) کا مشورہ دے رہا تھا تو کوئی درمیانے درجے (Mediam Wave)
سب حربے آزمائے لیکن مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ شاید لوگ سادہ دل اور بھولے
تھے۔ انہیں کیا معلوم کہ ان کے ابتدائی اور نو آزمودہ نظام کو ایک نئی آزمائش میں ڈال دیا گیا
ہے۔ خاص طور پر کمروں میں بند لوگوں نے جب اپنے ریڈیو سیٹ چلائے یعنی (on) کیے تو
انہیں زیادہ الجھن ہوئی۔ جی، ہاں، شی، شوں شاں پروگراموں کا نام ونشان تک نہیں۔ تھک
ہار کر انتظار کرنے لگے کہ شاید کہیں سے نئی صورت حال کا سراغ مل جائے اور جانکاری ہو
سکے کہ آخر ہوا کیا؟

گہری سوچ وبچار کے بعد یہ پتہ چلا کہ دشمن نے اپنے استعمارانہ عزائم کی راہ میں
ریڈیو کی نشریات کو بہت بڑی رکاوٹ سمجھا اور بعد ازاں سائنسی حربے استعمال کر کے اسے
ناقابل عمل بنادیا۔ ریڈیو اب عام لوگوں تک خبر رسانی کا ذریعہ نہ رہا۔ انقلابی قیادت ایک
اور امتحان سے دوچار ہوئی۔ گو ایک بدوی زندگی گزارنے والا معاشرہ، جو سائنسی طور پر اتنا
پسماندہ ہو، وہ ایک ترقی یافتہ استعمار کا مقابلہ بھلا کیسے کرسکتا ہے۔ لیکن قدرت کا کھیل عجیب
ہے کہ مزاحمت کاروں کے سینے قوت ارادی سے کچھ اس طرح معمور ہوتے ہیں کہ انہیں اپنی
فتح کا یقین ہوتا ہے۔ بڑی سے بڑی مصیبت اور آزمائش بھی ان کے راستے میں رکاوٹ
نہیں بنتی۔ تمام قیادت نے اس بات پر اتفاق رائے کا اظہار کیا کہ اس رکاوٹ کو دور کر کے
قیادت اور عام شہریوں کے درمیان خلا کو از سر نو پُر کیا جانا وقت کا اولین تقاضا ہے تاکہ
آزادی کی منزل تک پہنچنے میں مزید آسانی ہو سکے۔

ریڈیو اور شہریوں میں کچھ عجیب سا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ اب دونوں ایک دوسرے کے

لیے لازم وملزوم تھے۔ الجزائری عوام پہلے دبے ہوئے اور افتادگان خاک تھے۔ ریڈیو نے انقلابی قیادت کی مسلح سرگرمیوں سے انہیں باخبر کر کے اس قابل بنایا کہ وہ مزید غور وفکر کریں اور آزادی کی جدوجہد میں کسی نہ کسی حوالے سے اپنا کردار ادا کریں۔

سامراج نے اپنی نوآبادیات میں اپنے پاؤں جمانے اور مزید اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے عجیب وغریب قسم کے پراپیگنڈے کیئے تاکہ لوگوں کا مورال گرا سکے۔ اس کے برعکس ریڈیو الجزائر جو حقیقت میں لوگوں کے من کی آواز تھی، ان استعمارانہ حربوں کے خلاف ایک ڈھال بن گیا۔ یہ نہ صرف فرانسیسی میڈیا کے پھیلائے ہوئے پراپیگنڈے کی تردید کرتا بلکہ قوم کو حقیقت بارے آگاہ بھی کرتا۔ بعض اوقات یہ عام نشریات کو روک کر خصوصی بلیٹن کا بھی اہتمام کرتا۔

ریڈیو الجزائر اس قدر اہمیت کا حامل ہوگیا کہ اس کا وجود ہر جگہ محسوس کیا گیا، اس کی حقیقت ہر جگہ پائی گئی۔ لوگوں کو انقلابی قیادت کے عمل کا پوری طرح احساس ہوگیا کہ وہ کس دلجمعی کے ساتھ دشمن کی طرف سے کیے گئے پراپیگنڈے سے جواب دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دشمن نے جس ڈھٹائی کے ساتھ قومی ثقافت کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی، ریڈیو الجزائر نے اسی شدت کے ساتھ استعماری ہتھکنڈوں کے صرف خلاف مزاحمت کی۔ ریڈیو الجزائر صرف ایک نشریاتی ادارہ نہیں رہا تھا بلکہ یہ مجاہدین کا ریڈیو تھا جو مسلح الجزائر کے نام پر اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ یہ محض ایک مواصلاتی ادارے کی آواز نہ تھی۔ اس آواز نے استعمار کے خلاف نبرد آزمائی کو آخری حدوں تک پہنچایا۔

الجزائر میں شہریوں کی عادت تھی کہ شام سات بجے سے لے کر رات گئے تک نشریات سنتے۔ اس دوران بڑی سے بڑی تبدیلیاں رونما ہوتیں۔ نشریات چلنے کے کچھ دیر بعد اچانک رک جاتیں۔ بعض مرتبہ سامع (Listener) کو اچھی خاصی مایوسی ہوتی وہ بار بار سوئی کو ادھر ادھر کرتا لیکن تھک ہار کر ریڈیو بند کیے بغیر سو جاتا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے

فرانسیسی استعمار نے مجاہدین کے ریڈیو میں خلل ڈالنے کی کوشش کی جس سے ان کی نشریات بری طرح متاثر ہوتیں لیکن ریڈیو الجزائر کے ساتھ لوگوں کی رغبت کئی گنا ہوگئی۔ یہ آوازان کے کانوں میں رس گھولتی۔ اس سے ان کے دل ودماغ معطر ہو جاتے۔ یہ آوازان کے ضمیر کو جھنجھوڑتی اور انہیں آزادی کی رغبت دلاتی۔ یہ صرف آواز نہیں تھی بلکہ اس جنگ کی یاددہانی تھی جو حاکم اور محکوم، ظالم اور مظلوم کے مابین لڑی جا رہی تھی۔

مزید برآں فرانسیسی سٹیشنوں نے ایک مکاری یہ بھی کی کہ فضا میں ایسے سسٹم قائم کیے کہ جو ریڈیو الجزائر کی نشریات کو بار بار خراب کرتے، جب ریڈیو فرانس کی نشریات ختم ہوتیں اور خبروں کا سلسلہ بند ہوتا تو اس کے ساتھ ہی ریڈیو الجزائر کی فری کوائنسی (Frequency) ٹھیک سے کام کرنے لگتی۔ عموماً اس دوران جنگی ترانے چلا کر شہریوں اور انقلابیوں کے جذبات کو جلا بخشی جاتی اور ان کے دل میں جذبہ حب الوطنی ابھارا جاتا یہاں ملک کے گلیوں بازاروں میں بچوں کی زبانوں پر

میرے بیٹے یہ ماں تجھ پہ واری رہے
جنگ جاری رہے جنگ جاری رہے

کے ترانے گونجتے۔ ریڈیو الجزائر پہ چلائے گئے جنگی ترانے اس قدر اہمیت کے حامل ہوتے کہ ان کا سرور مہینوں تک لوگوں کے دل ودماغ میں رہتا جو کہ ان کے قومی ضمیر کو بیدار اور مضبوط کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتا۔

نفسیاتی سطح (Psychopathological Level) پر اگر ریڈیو سروس کا تجزیہ کریں تو پھر بعض امور کے حوالے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ریڈیو الجزائر اور تحریک آزادی میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ 1954ء سے قبل فرانسیسی ریڈیو پر جتنے بھی پروگرام چلائے جاتے وہ غیر انسانی بنیادوں پر ہوتے تھے۔ ان میں مقامی لوگوں کے رسم ورواج، عادت، مذہب اور دیگر ثقافتی پہلوؤں کو نہ صرف نظر انداز کیا جاتا بلکہ بری طرح نشانہ

بنایا جاتا۔ اس کے علاوہ یہ پروگرام ایسے خطرناک ہوتے تھے جتنی کہ عہدِ وسطیٰ کی عیسائی عدالتیں (Inquisition) جہاں مذہب کی نظر میں مجرم ٹھہرنے والوں کو اذیت ناک سزائیں دی جاتیں (وقت کے عظیم ترین سائنس دان بھی ان عدالتوں کے جبر و ستم سے محفوظ نہ رہے، یہاں تک کہ برونو جیسے نابغہ روزگار سائنس دان کو سائنسی انکشاف کی پاداش میں زندہ جلا دیا گیا اور گلیلیو کو بھی چوروں کے ساتھ کٹہرے میں لا کھڑا کیا گیا لیکن اس نے بظاہر اپنی بات سے انحراف کر کے اپنی جان بخشوائی۔ ان عیسائی عدالتوں کا اصل نشانہ وہ بدنصیب مسلمان بنے جو ایک خدا کی بندگی کرنے والے تھے) سامراج کے ہاتھوں میں ریڈیو ایک قبضے کا ذریعہ تھا۔ الجزائر پر قبضہ...... تیسری دنیا پر قبضہ...... مقامی لوگوں کے دماغ پر قبضہ...... ان کی ثقافت پر قبضہ۔ ریڈیو کا اتنا منفی اثر تھا کہ لوگ اپنے کلچر سے جدا ہو کر رہ گئے۔ ریڈیو پر ایسے ایسے پروگرام نشر کیے جاتے کہ لوگوں میں اپنی ذات سے بیزاری کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافت سے نفرت پیدا ہو گئی۔ اس چیز نے نفسیاتی طور پر انہیں تنہائی کا شکار کر کے رکھ دیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔ فرانسیسی ریڈیو پر سنی جانے والی آواز غیر جانبدار نہیں، بلکہ یہ استعمار کی آواز ہے...... حاکم کی آواز...... غاصب کی آواز...... دشمن کی آواز۔

الجزائر کے لوگوں میں میڈیا اور انقلابی جدوجہد کی بدولت ایک شعور پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ استعمار کی چالوں کو سمجھنے لگے

جو تم سے دل نہ لگائے، تم اسے منہ نہ لگاؤ

کے مصداق الجزائر شہری بھی فرانسیسی ریڈیو کے ذریعے نشر کردہ پروگراموں کو کوئی خاص توجہ نہ دیتے، نہ ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے بلکہ سنتے ہی نظر انداز کر دیتے۔ انہوں نے اس کے بارے میں کبھی تجسس نہیں کیا بلکہ اس کی حقیقت سے ہی انکار کر دیا۔ 1954ء سے قبل ریڈیو ایک برائی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن 1954ء کے بعد لوگوں میں شعوری انقلاب پیدا ہونے سے صورت حال سراسر تبدیل ہو کر گئی۔ اب یہ وائرلیس سسٹم کے ذریعے چلنے والے

[illegible]ٹی پراپیگنڈے اور بدگمانیوں کے بجائے ایک دوستی کی آواز میں تبدیل ہو گئے۔ قوم کا احساس محرومی ختم ہو گیا۔ اب ریڈیو کی آواز انہیں ذہنی طور پر ڈسنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کرتی۔ المختصر وہ جدید تکنیک جو استعمار نے الجزائر میں اپنے مضموم مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کی تھی، وہ شہریوں کے لیے ظلم کے خلاف جنگ کے دوران ایک [illegible]ال بن گئی، جس سے انہیں محاذ جنگ پر ہونے والی پل پل کی صورت حال بارے آگہی [illegible]اتی۔ یہ چیز ان کے اضطراب میں کمی اور اطمینان میں اضافے کا باعث بنی۔

اس کے ساتھ ساتھ انقلابی تحریک کا ایک بہت ہی پُر مغز اثر ہوا وہ یہ کہ

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کے مصداق فرانسیسی زبان خود استعمارانہ مقاصد کے بجائے آزادی کی آواز بن گئی۔ وہ آواز جو لوگ اپنے مقامی کلچر کے خلاف ایک گالی سمجھتے تھے پہلے ان کے ذہنوں میں یہ بات تھی کہ فرانسیسی زبان میں کہی جانے والی ہر بات ان کے لیے زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ علمائے کرام نے اپنے روایتی انداز میں لوگوں کے ذہن میں یہ بات ڈال دی۔ "دشمن کی زبان سیکھ لو اس کے فتنے سے محفوظ ہو جاؤ گے۔" ریڈیو الجزائر نے اپنی خبروں کی نشریات فرانسیسی زبان میں بھی شروع کر دیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات سما گئی کہ زبان میں بھی انقلاب پیدا کیا جائے اور اسے دشمن کی عیارانہ سازشوں سے نجات دلا کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کی جائے۔ اب ایک ہی پیغام تین زبانوں میں دیا جانے لگا۔ فرانسیسی زبان جب استعمار کے ہاتھوں میں تھی، یہ محض مقامی ثقافت کو مسخ کرنے کا ذریعہ تھی۔ لیکن جب مجاہدین نے خود اپنے مقصد کے لیے اسے استعمال کی تو یہ ان کے لیے رحمت ثابت ہوئی۔ اور اس طرح ایک مقامی تکنیک عالمگیر سچائی کی مظہر بن کر اٹھی۔ فرانسیسی آواز نے اپنی کمینگی ترک کر کے لوگوں تک وہی پیغام پہنچانا شروع کر دیا جس کا انہیں انتظار رہتا۔ اگرچہ یہ بڑے اچنبھے کی بات تھی لیکن اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ کریڈٹ لبریشن فرنٹ اور اس کی انقلابی

قیادت کو جاتا ہے کہ جس نے قوم میں فرانسیسی زبان کی اشاعت کو آسان بنایا۔

غاصب حکام مجاہدین کے اس رویے سے بالکل نابلد تھے جو الجزائر کے لوگ فرانسیسی زبان کے ساتھ کر رہے تھے۔ اب فرانسیسی زبان جاننا، سمجھنا اور اس میں سوچنا سازش کے مترادف نہ تھا جس کا جال استعمار نے آغاز میں بچھایا تھا اب یہ آواز لوگوں کی اپنی آواز تھی...... ان کے ضمیر کی آواز...... آزادی کی آواز...... روشن خیالی کی آواز...... ظالم حکمرانوں کے خلاف پسے ہوئے طبقے کی آواز۔ یہ آواز آزادی کو دبانے کے بجائے اس کے اظہار کا ذریعہ بن گئی۔ جب استعمار نے دیکھا کہ الجزائری لوگ اتنی تیزی سے فرانسیسی زبان پر عبور حاصل کر رہے ہیں اور یہ کہ فرانسیسی زبان کو انہوں نے اپنے نظریات اور خیالات کے مطابق ڈھال لیا ہے تو استعمار کو اس بات کی فکر دامن گیر ہوئی کہ کس طرح وہ لوگوں کو نیچا دکھا کر ان میں احساس محرومی پیدا کریں۔

لیکن اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ یعنی لبریشن فرنٹ کی اعلیٰ قیادت نے وادی سومام میں ایک خصوصی اجلاس کا اہتمام کیا اور وہاں انقلابی جدوجہد کو سیاسی رنگ دینے اور تحریک آزادی کو وسعت بخشنے کے لیے قومی کونسل برائے انقلاب الجزائر (National Council of the Algerian Revolution) کی بنیاد رکھی۔ جب اعلیٰ قیادت نے اس زندہ حقیقت کا اعلان ریڈیو الجزائر پر فرانسیسی زبان میں کیا تو یہ بات استعمار کے لیے ایک بجلی بن کر گری۔ انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ الجزائر میں فرانسیسی زبان دم توڑ چکی ہے۔ اس زبان کو سمجھنے اور بولنے والوں کی تعداد میں گوناگوں اضافہ ہو چکا ہے، لیکن اب وہ اس کے اسیر نہیں رہے۔ یہ زبان ان کو اپنے رنگ میں نہیں رنگ سکتی۔ مقامی لوگوں نے اس زبان کی زلف گرہ گیر سے اپنے دل کا دامن آزاد کروالیا ہے۔ یہ ان کے گھر کی لونڈی ہے جسے وہ جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ مقامی لوگوں میں آزادی کا وہ جذبہ پیدا ہوگیا جس نے انہیں غاصب حکمرانوں کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ اور وہ کسی بات

مفاہمت (Compromise) نہیں کریں گے سوائے آزادی کے جو کہ ان کے ضمیر کی انفرادی اور اجتماعی آواز بن چکی ہے۔

فرانسیسی سامراج کو اس بات سے شدید صدمہ پہنچا۔ جب اس نے الجزائر پر غاصبانہ قبضہ کیا تو پہلے لوگوں کے دل میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کی کہ مقامی لوگوں کی نمائندہ زبان ایک پسماندہ زبان ہے جو عصر حاضر کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہے، کیونکہ جدید تہذیب سائنسی تکنیک اور رویہ جات پر مشتمل ہے اور اس کا اظہار صرف اور صرف فرانسیسی زبان یا دیگر مغربی زبانوں میں ہی ممکن ہے مقامی لوگ چونکہ اس زبان سے نفرت کرتے ہیں لہٰذا انہیں ہمیشہ کے لیے استعمار کا غلام رہنا پڑے گا۔ اس سے بڑھ کر فرانسیسی حاکم سوچتے تھے کہ اب الجزائر پر ان کا جو قبضہ ہوگیا ہے وہ دائمی ہے، اسے کسی صورت پلٹایا نہیں جا سکتا۔ لیکن ان کے تمام خواب چکنا چور ہوگئے جب مجاہدین نے اپنے حسن عمل اور پختگی کردار سے ثابت کر دیا کہ

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے میری

اب فرانسیسی زبان کی حیثیت سب پر عیاں ہوگئی اس کے الفاظ اس کے اشارے کنائے، اس کی تشبیہات مقامی لوگوں پر آشکارا ہوگئے۔ لوگوں پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ حاکم لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ 1954ء سے قبل قوم پرست جماعتوں کا منشور عربی زبان میں متعارف کروایا گیا۔ اور اس غرض سے قبائلیہ اور دیگر علاقوں کے مجاہدین آزادی نے عربی زبان سیکھنے کو ترجیح دی۔ 1954ء سے قبل الجزائر کے باسی فرانسیسی زبان کو دین مروت کے خلاف ایک گھناؤنی سازش سمجھتے تھے۔ انقلابی قیادت نے اپنے لوگوں کو اس حقیقت سے روشناس کروانے کے لیے کہ استعمار اور حاکم محکوم لوگوں کو کس چیز سے محروم کرتے ہیں اور کس طرح بے وقوف بنا کر ان کی متاع حیات کو اجیرن بنا دیتے ہیں، پہلے اپنی زبان کا سہارا لیا پھر فرانسیسی زبان کو

اپنے نظریات کے پھیلاؤ کے لیے استعمال کیا اور بالآخر نظریاتی غلامی کا جواز اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا۔ اب صورت حال پوری طرح بدل چکی تھی۔ جب کوئی شہری ریڈیو کو چیک کرتا تو اپنے سیٹ پر کئی چینل پاتا جن پر عربی علاقائی اور فرانسیسی زبانوں میں نشریات قابل سماعت ہوتیں۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ریڈیو الجزائر نے وقت کے تقاضوں کے مطابق کتنی سرعت سے انقلابی اقدامات کیے۔ شروع شروع میں جب ریڈیو نشریات کا آغاز ہوا تو یہ محدود پیمانے یعنی (Short Waves) پر تھا لیکن بعد ازاں اسے ترقی دے کر وسیع پیمانے (Long Waves) کے ذریعے ملایا گیا۔ اب پہاڑوں میں بسنے والا شخص بھی انقلابی قیادت کے اقدامات اور کارروائیوں سے بخوبی آگاہ ہوسکتا تھا۔ 1954ء سے پہلے ریڈیو حاکم کی آواز تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی نشریات سننا مقامی لوگوں کے دل و دماغ میں زہر گھولنے کے مترادف تھا۔ 1954ء سے قبل ریڈیو مقامی لوگوں کو مغرب زدہ کرنے کی ایک سازش سمجھا جاتا تھا۔ یہ ظالم حاکموں کی آواز تھی۔ یہ ایک آمرانہ فیصلہ تھا جس کا مقصد مقامی لوگوں کی گردن کو غلامی کے ساز دلبری کا اسیر بنانا تھا۔ یہ ایک حربہ تھا جس کا مدعا مقامی لوگوں کو ذہنی طور پر استعمار کے ہاتھوں یرغمال بنانا تھا۔

شروع شروع جب کوئی مقامی شہری ریڈیو سیٹ چلاتا یعنی (On) کرتا تو اس کے ذہن میں کئی طرح کے سوال آتے۔ ''ہمیں تو پتہ نہیں چلا کہ اب کون سا پروگرام سنیں اور کون سا رد کریں۔'' بعض سامعین کو شکایت ہوتی کہ ہم اندھیرے میں ٹٹول رہے ہیں، کہیں سے اس بات کا سراغ نہیں مل رہا کہ کون سا پروگرام لگایا جائے گا۔ اس کے علاوہ جب ان پر ذرا مذہبی جذبات غالب آتے تو وہ کہنا شروع کر دیتے کہ ''لعنت بھیجو یہ کافروں کا چینل ہے۔'' ان میلانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مقامی لوگ کس طرح ریڈیو فرانس کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کرتے۔

اس کے برعکس جب ریڈیو الجزائر نے اپنی قومی نشریات کا آغاز کیا تو لوگ خبروں کی نشریات کے وقت بے چین ہو جاتے اور جب تک سلسلہ جاری رہتا، انتہائی توجہ سے ریڈیو پر کان لگائے رکھتے تاکہ تازہ ترین حالات کے بارے میں جانکاری کر سکیں۔ اب ریڈیو ایک نفرت کی علامت کے بجائے محبت کی علامت بن گیا۔ یہ لوگوں کے لیے ناگزیر ہو گیا، الجزائر ریڈیو نے انہیں فکر کی دنیا سے نکال کر انقلاب کی صفحوں میں لا کھڑا کیا اور انہیں حق و باطل کے مابین ہونے والی کشمکش میں سینہ سپر ہو کر کودنے کا حوصلہ دیا۔

یاد رہے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب نازی جرمنوں نے پولینڈ، بیلجیئم اور فرانس پر قبضہ کر لیا تو ان کے عوام میں عجیب احساس تنہائی و محرومی پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے مرکز سے کٹ کے رہ گئے۔ وہ ایک بے منزل مسافر کی طرح ہو گئے جو صحراؤں میں بھٹکتا پھر رہا ہو لیکن جب برطانیہ نے لندن کو ہیڈ کوارٹر بنا کر ان لوگوں کی آگاہی کے لیے پولینڈ، ہنگری اور فرانسیسی زبانوں میں نشریات کا آغاز کیا تو لوگوں نے برطانوی حکومت کے اس نظام کو بڑا سراہا اور اس کے پروگرام میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ اس لیے کہ ان لوگوں کا احساس تنہائی ختم ہو گیا اور انہیں تمام نشیب و فراز کا پتہ چل گیا کہ عالمی تناظر میں کیا ہو رہا ہے اور وہ اس وقت کہاں کھڑے ہیں؟ ان کو کون کون سے چیلنج درپیش ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان کے پاس کتنے وسائل ہیں اور مزید انہیں کس چیز کی ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ریڈیو جو آغاز سفر میں گناہ تصور کیا جاتا تھا اب وہ لوگوں کے لیے رحمت ثابت ہوا۔ جو درد بن کے آیا ہی درد کی دوا ثابت ہوا۔ ریڈیو الجزائر نے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر کے رکھ دیا۔ اس دوران یہ بات قابل دید ہے کہ یہ جہالت سے روشن فکری تک کا یہ سفر ارتقائی حوالے سے طے نہیں کیا گیا بلکہ انقلابی طریقے سے طے کیا گیا۔ لوگوں کے مطمع نظر میں بنیادی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ ریڈیو الجزائر نے لوگوں میں زندگی کی نئی روح پھونک دی۔ انہیں جینے کا سلیقہ آ گیا۔ ان پر یہ منکشف ہو گیا کہ

غلامی کی وجہ سے وہ کون سی جنس گرانمایہ سے محروم کردیے گئے اور اب اس کے دوبارہ حصول کے لیے کیا چیز ضروری ہے۔

اس سے ایک قدم اور بڑھ کر دیکھیں تو ریڈیو سروس کو عروج اس وقت حاصل ہوا جب ریڈیو الجزائر اپنے وطن کی سرحدیں پھلانگ کر دیگر ممالک تک پہنچ گیا۔ حملہ آور فوجی جب کسی علاقے میں آپریشن کرتے تو لوگوں کو ذہنی طور پر بڑے نظام سے توڑنے کے لیے ان سے ریڈیو چھین کر ضبط کرلیتے اور اپنی سائنسی برتری کے جنون میں سسٹم جام کردیتے۔ لیکن انقلابی قیادت کے بروقت اقدامات کی بدولت ریڈیو الجزائر عالمگیر حقیقت کا حامل بن کر سامنے آیا۔ اب ریڈیو الجزائر کی نشریات استعمار کے قبضے سے آزاد ہوگئیں۔ سامع کو الجزائر کی نشریات سننے کے لیے مقامی اسٹیشن کا مرہون منت نہیں ہونا پڑتا تھا۔ اب یہ آواز بیک وقت ریڈیو، مصر، تیونس، مراکش اور دمشق سے سنی جاسکتی تھی۔ لیکن اس کا سہرا الجزائر کی انقلابی قیادت کے سر ہے جنہوں نے عوام کو اپنے ساتھ جوڑنے کے لیے دیگر ریاستوں سے معاہدے کرکے وہاں سے اپنی نشریات کا آغاز کیا۔ ان کا احساس محرومی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اب وہ ملت اسلامیہ کے جسد واحد سے منسلک ہوگئے۔ آزادی کی جنگ اپنے عروج پر چلی گئی۔ استعمار مایوس ہوگیا۔ اس نے اپنے ظالمانہ نظام کو مقامی لوگوں پر مسلط کرنے کے لیے نہ جانے کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کیے، کیا کیا حربے آزمائے، کیسی کیسی سازشیں اور مکاریاں کیں، جب کچھ نہ بن پایا تو لوگوں کو دبانے کے لیے خاک وخون کا کھیل شروع کردیا۔ نہتے لوگوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے، معصوم لوگوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی، بچوں کو سرِ بسمل تڑپایا، جوانوں کو خون میں نہلایا، ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عصمت کو تار تار کیا لیکن تمام سازشیں، مکاریاں، عیاریاں، ظلم و بربریت اور شیطانی حربے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ محکوم جاگ اٹھے۔ افتادگان خاک بیدار ہوگئے، پسماندگان بے تاب ہوگئے، ان کے ذہنوں میں روشن فکری اور دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا ہوگئی۔

انہوں نے اپنی عزت وعصمت، مال و دولت اور جاہ وجلال کی حفاظت کے لیے ہتھیار اٹھا لیے۔ ان کے پاؤں میں پڑی تمام بیڑیاں اُتر گئیں، عقل کے پردے چاک ہوگئے، فکری جمود ٹوٹ گیا۔ اب ان کے سامنے ایک ہی مقصد تھا آزادی...... آزادی...... اور آزادی اور اس کے لیے انہیں کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ چکانا پڑے۔ وہ ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھے۔ ان کی راہ میں نہ کسی کی محبت آڑے آئی نہ کسی کی نفرت، محبت ہوئی تو آزادی سے اور نفرت ہوئی تو ظالم سامراج سے جس نے ان کی جمالی اور جلالی اقدار کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ ان کے ایک ہاتھ میں بندوق دوسرے ہاتھ میں ریڈیو اور دل میں آزادی کے حصول کا جذبہ۔ وہ چلتے گئے چلتے گئے ان کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں آئیں، بے پناہ عذاب نے انہیں گھیرا، کبھی بھوک نے تنگ کیا، کبھی جان مال اور کھیتوں کا نقصان ہوا لیکن کوئی رکاوٹ ان کے قدم آگے بڑھنے سے نہ روک سکی۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے کتاب حقیقت نے اپنے ابدی پیغام میں کہا:

وَلنبلونکم بشیٔ من الخوف و الجوع و نقص من الاموال والانفس والثمرات ، بشر الصبرین الذین اذا اصابتھم مصیبہ، قالو انا للہ وانا الیہ راجعون . اولئک ھم الذین صدقوا و اولئک ھم المفلحون.

باب سوم

خانوادۂ الجزائر

گذشتہ باب میں ہم عورت کی شخصیت کے حوالے سے اس بات کا جائزہ بخوبی لے چکے ہیں کہ اس کے کردار میں کس طرح انقلابی تبدیلی رونما ہوئی اور پردہ جو ایک مذہبی فریضہ اور معاشرتی قدر تھی، کس طرح وقت کا ساتھ دے گی۔ باب ھذا میں ہم اس حقیقت پر روشنی ڈالیں گے کہ انقلاب برپا کرنے کے لیے الجزائر کے پورے خاندان میں کس طرح تبدیلی آئی اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگر پورا خاندان استعمار کا تختہ الٹنے کے لیے میدان میں نہ اُترتا تو کسی طرح انقلاب کا پیش خیمہ ثابت نہ ہوتا۔

بہر حال اس باب میں ہم یہ بھی دکھائیں گے کہ قومی آزادی کی اس تحریک کے دوران اہل خانہ کو کس حد تک ذہنی صدمہ پہنچا اور اس کرب کی وجہ سے خاندانی نظام کس طرح تہہ و بالا ہوا۔ ان بچوں پر کیا بیتی ہوگی جن کے سامنے ان کے مجاہدین کو فرانسیسی سیکورٹی کار گھسیٹ کر لے گئے اور اس کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ یہ منظر اس قدر دل خراش تھے کہ آزادی کے متوالوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے گئے۔ اس عورت کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی جس کے سامنے اس کے سرتاج کو گرفتار کر کے خون میں نہلا دیا گیا ہو۔ اور وہ بے بسی کی بے جان تصویر بنی رہی۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ استعمار کے خلاف جنگ کے

دوران غیر شادی شدہ لوگ اتنے متاثر نہیں ہوئے تھے جس قدر شادی شدہ افراد کے ساتھ معاملہ ہوا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک غیر شادی شدہ مجاہد جب ظلم کے خلاف سر پر کفن باندھ کر نکلتا ہے تو اس کے سامنے دو ہی باتیں ہوتی ہیں کہ یا تو جدوجہد کے دوران اپنی جان دے دے گا یا استعمار کا تختہ اُلٹ کر اپنی قوم وملت کو آزادی سے ہمکنار کر دے گا۔ لیکن ایک ایسا شخص جس کے ساتھ پورا خاندان جڑا ہوا ہے، ایک طرف اس کی بیوی اور بچوں کی کفالت اور دوسری طرح ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام ایسی بھاری ذمہ داریاں ہیں کہ جن سے وہ کسی صورت بے نیاز نہیں ہوسکتا ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ خواہ وہ آزاد رہے یا مقید، ضروریات زندگی تو اس کے ساتھ ہر صورت میں جڑی رہتی ہیں۔ جب فرانسیسی سیکورٹی اہلکار ایک شخص کو گرفتار کر کے پس دیوار زنداں ڈال دیتے تو اس کی اہلیہ اور بچوں کی کفالت کا کوئی ذمہ دار نہ ہوتا نتیجتاً بچے بھوک اور پیاس کی وجہ سے بلک بلک کر اپنی جان دے دیتے اور ماں مجبور ہو کر کف حیرت ملتی رہ جاتی۔ آغاز میں جب اس طرح کی مثالیں سامنے آئیں، اب دو ہی راستے تھے کہ یا تو اس کو یونہی برداشت کر کے استعمار کے خلاف جنگ جاری رکھی جائے لیکن انسانی فطرت ہے جب رکاوٹیں بڑھتی ہیں تو انسان اپنے مسائل میں ہی الجھ کر رہ جاتا ہے۔ ایسے میں جدوجہد آزادی ایک افسانہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا اس کے پیش نظر اس بات میں ہم دکھائیں گے ایک معاشرے میں کون کون سی تبدیلیاں رونما ہوتی اور پھر کس طرح ان کا ارتقاء ہوا اور قیادت نے ان مسائل اور مصائب پر قابو پانے کے لیے کیا کیا اقدامات کیے۔

اس معاملے میں ہمارے سامنے جو سب سے خطرناک تبدیلی رونما ہوئی وہ خاندانی وحدت کی شکست وریخت ہے۔ خاندان کا ہر ممبر تنہائی کا شکار ہوگیا، وحدت جاتی رہی اس طرح خاندانی اقدار بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوگئیں اور ان کی جگہ پریشان حالی اور فرسودہ اقدار نے لے لی۔ خاندان کے ہر شخص کے سامنے ایک نیا چیلنج تھا اور اس نے اس

سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نئی راہوں کا انتخاب کیا اور پرانے سیٹ اپ کو چھوڑ کر نئی راہوں کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ کسی معاشرے کی آشیاں بندی میں اس کی اقدار کو بنیادی ستون کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن صورت حال اس قدر گھمبیر ہوگئی کہ یہ اقدار معاشرتی وحدت کے قیام کے لیے غیر موثر ثابت ہوئیں اور رفتہ رفتہ دم توڑنے لگیں۔ عمرانی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی معاشرے کی اقدار صرف اس کے قدیم رسم ورواج اور بندھن ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کے پس پردہ کچھ محرکات بھی ہوتے ہیں جن کی بناء پر یہ اقدار پروان چڑھتی ہیں۔ روایتی اور پدری معاشرے میں جہاں بیوی اور بچے والد کے زیر سایہ پروان چڑھ رہے ہوں۔ انہیں اپنے والد کے کسی فیصلے کے خلاف دم مارنے کی جرأت نہیں ہوتی لیکن یہاں صورت حال یہ ہوگئی کہ بچوں نے اپنے والد سے اس کی شب وروز کی سرگرمیوں کے بارے میں مختلف قسم کے سوال کرنا شروع کر دیے۔ بچوں کو مطمئن کرنا والد کے فرائض منصبی میں شامل ہوگیا کہ اپنی انقلابی سرگرمیوں کے بارے میں بچوں کو آگاہ کرے اور منصفانہ توجیہہ پیش کرے۔

استعمار کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے ایک باپ کا رویہ اپنی اولاد کے ساتھ بے غرضی کا سا ہوگیا۔ اس نے بچوں کے ضروری امور میں دلچسپی لینا کم کردی۔ جب تحریک آزادی کی ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر آن پڑیں تو اس نے اپنے خاندانی فرائض سے بے رغبتی برتی اور حد درجہ غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا۔ اس صورت حال کا سامنا چند افراد کی حد تک محدود نہ رہا بلکہ پورے ملک میں یہ صورتحال دیکھنے میں آئی۔ وجہ یہ ہے کہ معاشرہ استعمار کے خلاف ایک انگڑائی لے رہا تھا تا کہ اپنے کندھوں سے غلامی کا جوا پھینک کر نئی دنیا کی تعمیر کر سکے۔

1954ء سے قبل سیاسی جماعتوں نے اپنے مزاج اور منشور کے مطابق نجی زندگی میں نئی تبدیلیوں سے متعلق بعض اصول متعارف کروائے۔ قوم پرست جماعتوں، سیاسی حکمت

عملی اور فرانسیسی آقاؤں کے خیموں کی طنابیں اکھاڑنے کے انقلابی نعروں نے فرد کو ایک حد تک اپنے خاندان سے ذہنی طور پر جدا کر دیا تھا۔ وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ایک چھت کے نیچے رہ رہا تھا، زندگی کے شب و روز اُن کے ساتھ گزارتا لیکن اس کے باطن میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہو چکی تھی اور وہ اس تبدیلی کو مزاحمت میں بدل کر غاصب حاکموں کے خلاف صف آرا ہونے کے درپے تھے۔ ظاہر ہے سخت اقدار میں جکڑے ہوئے معاشرے میں ان تبدیلیوں کا مستقبل کیا ہونا چاہیے تھا۔ قوم پرست جماعتوں نے اس ذہنی جمود کو توڑنے کے لیے نوجوانوں میں شعور و آگہی کی تحریک چلائی تاکہ انہیں ذہنی غلامی سے آزاد کر کے میدان عمل میں لایا جا سکے، اور ان میں تحریک و تخلیق کا جذبہ پیدا کیا جا سکے۔ دنیا میں اٹھنے والی ہر تحریک کی پشت پر یہی تحریک و تحقیق ہی فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ لوگوں نے من حیث القوم سیاسی پارٹیوں کی آواز پر لبیک تو کہہ دی لیکن ان کے ذہنوں میں استعمار نواز پولیس اور فوج کے ان مظالم کی یادیں بھی نقش تھیں جو ان کے آباؤ اجداد اور ساتھیوں کے ساتھ روا رکھی گئیں۔ اس وقت یعنی 1954ء سے 40 برس قبل جب استعمار نے نام نہاد تہذیبی یلغار کے نام پر الجزائر کو فتح کیا تو اس وقت مقامی آبادی کے خلاف جو مظالم روا رکھے ابھی تک لوگوں کے حافظے میں وہ پوری طرح محفوظ تھے۔ انہیں یاد تھا کہ دشمن فوج کے دستوں نے کس طرح ان کے خاندانوں کو تہہ تیغ کر کے ان کے گھروں اور آشیانوں کو بے دردی سے نذر آتش کیا تھا۔ فتح کے بعد فرانسیسی استعمار کے علمبرداروں نے اتنی بڑی تعداد میں الجزائر میں نقل مکانی کی کہ ان کی تعداد لاکھوں میں بنتی ہے۔ پھر مزید یہ کہ ان باسیوں کی رہائش اور بود و باش کے لیے سینکڑوں نئی کالونیاں آباد کیں۔ ایسے میں اگر مقامی لوگوں کے دل میں کبھی آزادی کا جذبہ پیدا بھی ہوتا بھی تو پیدا ہوتے ہی دم توڑ جاتا کیونکہ استعمار کے خوف و ہراس اور ظلم و تشدد نے ان کے اعصاب شل کر کے رکھ دیئے۔ ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا۔ اول تو کبھی ان کے دل میں آزادی کی تڑپ پیدا ہی نہیں ہوئی اور کبھی ہوتی تو فرسودہ

پہ خام چلی جاتی۔ عمرانی حوالے سے قابل غور بات ہے کہ انقلابی جدوجہد کے ... نے اپنے والد کی کبھی بھی حکم عدولی نہیں کی بلکہ اس نے اپنے آپ کو اسی ... بندھن میں باندھے رکھا جو الجزائر جیسے روایتی معاشرے کا طرۂ امتیاز تھا۔ ایک ... معاشرے میں والد کی حیثیت ناقابل چیلنج ہوتی ہے لہٰذا کسی بیٹے کی طرف سے یہ گوارا نہیں کی جاتی کہ وہ اپنے والد کے سامنے منہ چڑھ کے کوئی بات کرے یا اس کے کسی فیصلے کو ٹھکرائے یا اس کی حکم عدولی کرے۔ والد کے سامنے آنے پر بچے میں وقار، شرم و ... اور بلند آواز میں بات کرنے سے ہچکچاہٹ جیسی عادات مسلسل قائم رہیں۔

اس کے بعد حالات میں ایک دم سے تبدیلی رونما ہوئی جب سیاسی جماعتوں نے ... دیکھا کہ سالہا سال کی سیاسی جدوجہد کے باوجود حالات جوں کے توں ہیں، ان میں ذرہ ... تبدیلی رونما نہیں ہوئی بلکہ وہ پہلے کی نسبت مزید دگرگوں ہو رہے ہیں۔ بالآخر انہوں نے سیاسی تحریک کو استعمار کے خلاف تحریک مزاحمت میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی تحریک کے روح رواں یہی نوجوان ہوتے ہیں، لہٰذا جب بیٹا اس انقلابی جدوجہد کا ... بنا تو اس کے رویے میں نفسیاتی طور پر بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ پہلے وہ اپنے والد کے ساتھ بات کرنے سے ہچکچاتا اور پست آواز میں مختصر بات کرنے کے بعد فوراً در پردہ چلا جاتا۔ انقلابیوں کے ساتھ چلنے کے بعد اس کے رویے میں بے کیفی نظر آنے لگی۔ اس کا رویہ قدرے گستاخانہ ہو گیا جو کہ معاشرتی اقدار کی ریختگی کا باعث بنا۔ والد اور دیگر اہل خانہ کے لیے یہ بات پریشانی کا سبب بنی۔ لیکن من حیث القوم اس رویے سے انقلابی جدوجہد کو فائدہ پہنچنے کے بجائے الٹا نقصان ہوا۔ لبریشن فرنٹ کی قیادت نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اسے فکر دامن گیر ہوئی اور اس نے اس بگاڑ پر قابو پانے کے لیے نئی حکمت عملی تیار کی اور کوشش کی کہ آزادی کی اس جدوجہد میں بیٹے کے ساتھ باپ کو بھی شریک کیا جائے۔ اس طرح دونوں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج پر ہو جائے گی اور دونوں ایک دوسرے کا دست و

باز و بن کر تحریک آزادی کو تقویت بخشیں گے۔

یکم نومبر 1954ء کو تحریک آزادی کی انقلابی قیادت پر نئی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ اس نے ایک طرف بے رحم استعمار کا جائزہ لیا تو دوسری طرف محکوم لوگوں کی حیثیت کو دیکھا تو نتیجہ اخذ کیا کہ کاروان آزادی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے، نوآبادیاتی نظام کو جڑ سے اکھاڑنے اور ایک نئے الجزائر کی تعمیر کے لیے اسے وسیع پیمانے پر تیاری کرنا پڑے گی۔ اس کے لیے اپنی رگوں میں خون کو گرمانا اور روح کو تڑپانا ہوگا۔ تحریک آزادی کی سیاسی سرگرمیوں کے بعد قیادت کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ اگر وہ قومی اُفق پر پھیلنے والی ظلمتوں کا خاتمہ کر کے نئی قوم کی تخلیق کے خواہاں ہیں تو اس کے لیے بنیادی تبدیلی لازمی ہے لیکن یہ تبدیلی انفرادی نہیں اجتماعی سطح پر ہونی چاہیے...... اس آرزو کی تکمیل کے لیے الجزائری شہری کو ایک نئی دنیا بسانا ہوگی تمام فرسودہ روایات کے بندھنوں کو توڑنا ہوگا۔ جو جدوجہد آزادی کے پُرخطر راستے پہ چلنے سے روکنے کے لیے اس کے پاؤں کی بیڑی بنی ہیں۔ اس طرح استعمار کے خلاف پنجہ آزمائی کے لیے سب سے پہلے جوانوں کو ذہنی طور پر تیار کیا گیا ذہنی جمود توڑا گیا، ان میں ایمان و حرکت کی قوت پیدا کی گئی۔ اب ہر شخص کسی کا ذہنی غلام تھا نہ وہ معاشرتی اقدار کا پابند تھا بلکہ وہ اپنا راستہ تلاش کرنے اور اس پر چلنے میں پوری طرح آزاد تھا۔

انقلابی جدوجہد میں باپ اور بیٹے کا رشتہ

معاشرتی حوالے سے بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جب فرانسیسی استعمار کے خلاف عملی جدوجہد کا آغاز ہوا تو اس وقت معاشرہ اپنی تمام تر اقدار کے ساتھ زندہ تھا۔ انقلابی قیادت کی کوششوں سے قومی ضمیر بیدار ہو چکا تھا۔ اس کے شعور میں ایک انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ لیکن اس انقلابی شعور و آگہی کا زیادہ تر اثر باپ کے بجائے بیٹے پر ہوا جو جدوجہد

آزادی کے منشور میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ والد نے بعض اوقات استعمار کے خلاف کوئی کڑوی باغیانہ بات کی ہو لیکن اس کا اظہار وقتی تھا یعنی یہ صرف ذہنی نفرت سے زبانوں تک آئی اور بغیر کسی عملی جہت کے حالات کے جبر میں دب کر رہ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ والد اپنے بیٹے کو کہتا کہ بیٹا آوارہ پھرنے اور ادھر ادھر سرگردانی سے گریز کرو۔ زیادہ وقت اپنے اہل خانہ کے ساتھ گزارو۔ اسے نصیحت کی جاتی کہ ہم تمہاری پسند کے مطابق تمہیں رشتہ ازدواج میں باندھنا چاہتے ہیں اس کے لیے تیار ہو جایئے۔ اپنی خانگی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارو اور اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے کی کوشش کرو لیکن اب یہ نصیحتیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ کیونکہ بیٹا کسی اور ہی راستے پہ گامزن ہونے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اسی طرح زندگی میں ہر الجزائری شہری پر ایسا لمحہ آیا کہ اس نے فرانسیسی استعمار کو اپنے لیے زہر قاتل سمجھا اور پھر اسے جڑ سے اکھاڑنے کی بات کی۔ ہر ایک کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کسی نہ کسی طریقے سے نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ کیا جائے تاکہ ملک و ملت حقیقی آزادی سے بہرہ مند ہو سکے۔ لیکن اس طرح کی گفتگو ہوٹلوں، قہوہ خانوں، خرید و فروخت کی جگہوں، اور خاص طور پر قومی تہواروں کے موقع پر سننے میں آتیں۔ بڑے بڑے قومی تہواروں میں شائد ہی ایسا موقع آیا ہو جب لوگوں نے استعمار کے خلاف کوئی سازش نہ کی ہو۔ لیکن اس کی حقیقت بے اثر اور بے جان تھی۔ لوگوں کے دلوں میں بغاوت کا جذبہ بیدار ہوتا لیکن جب اس کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت آتی تو اس آرزو کا وہی حال ہوتا جو کہ اکثر اداس نسلوں، پریشان حال اور افتادگان خاک کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ استعمار کے ظلم و تشدد سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے اور پھر اپنے ان ابتدائی اور لمحاتی جذبوں کو دبا پر دوبارہ کارزار حیات کی بھول بھلیوں میں مگن ہو جاتے۔

حالات خاصے تبدیل ہو چکے تھے۔ نومبر 1954ء میں استعمار کے خلاف مزاحمت کا آغاز ہو چکا تھا اس سے پہلے باپ حالات کی تلخی کا صرف زبانی شکوہ کرتا اور خون کے آنسو

پی کر رہ جاتا۔ مزید یہ کہ اس نے اپنے فرزند ارجمند کو بھی اسی قدر کا گرویدہ بنائے رکھا، لیکن اب باپ بیٹے میں خلیج بڑھ چکی تھی۔ باپ جب فرانسیسی اہلکاروں کی کوئی حرکت دیکھتا تو صرف پریشان ہوتا لیکن بیٹے میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے اضطراب کو نفرت میں تبدیل کیا، اسے اپنے دل و جان کا حصہ بنایا، اپنے اعصاب پر سوار کیا اور فیصلہ کیا کہ جب تک مغربی آقاؤں کی غلامی سے ملک و ملت کو چھڑا نہیں لیتا، چین سے نہیں بیٹھے گا۔ اب آزادی و عزت نفس ہی زندگی کا مقصد قرار پائی۔

باپ نے جب بیٹے کی ذہنی کیفیت دیکھی تو اسے پریشانی لاحق ہوئی۔ اس کے سامنے معاشرتی اقدار اجڑ رہی تھیں جن پر اس کا خاندانی وقار استوار تھا۔ مزید برآں باپ نے روایتی انداز میں بیٹے کو سمجھانا شروع کیا۔ اس کے ذہن میں 1954ء سے پہلے کا نقشہ آ گیا کہ نوآبادیاتی نظام کی پولیس الجزائری آبادیوں کو کس نفرت سے دیکھتی ہے اور پھر ان کو اکھاڑنے بچھاڑنے اور ان کی سراغرسانی میں کس حد تک بے چین رہتی ہے اور جب کسی کو نام نہاد قانون شکنی کا مرتکب پاتی ہے تو کس طرح ظلم و تشدد کا طویل و سنگین سلسلہ شروع کر دیتی ہے۔ باپ نے بیٹے کو ناصحانہ انداز میں سمجھانا شروع کیا کہ ''دیکھو جس راستے پر تم چل رہے ہو یہ نہایت ہی پُر خطر ہے، استعمار کے خونی پنجے بہت مضبوط ہیں، تم ان کو اکھاڑنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے'' جب باپ بیٹے کو نصیحت کرتا تو بیٹے نے ابتدائی سطح پر کسی بدتمیزی یا گستاخی کا مظاہرہ نہیں کیا نہ دوٹوک جواب دیا بلکہ سراپا شرم و حیا اور آداب فرزندی کی سچی تصویر بنے کھڑا رہا۔ اس ردعمل سے باپ کو ایک حد تک یقین ہو گیا کہ شاید بیٹے نے خاموشی اختیار کر کے اپنی عاجزی و انکساری اور طاعت شعاری کا رویہ اختیار کر لیا ہے لیکن باپ کو کیا خبر کہ بیٹے کی خاموشی میں کتنے طوفان چھپے ہوئے ہیں اور اس کے ارادوں میں کتنی بجلیاں پوشیدہ ہیں۔ اس عجیب صورت حال سے دوچار ہونے کے بعد بیٹے کو فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ کس طرح اپنے والد کو اپنے من کی دنیا سے آگاہ کرے۔ اس کے

[illegible] کہ یا تو اپنے والد کی نصیحتوں کا احترام کر کے انقلابی سرگرمیوں کو خیر باد کہہ [illegible] کے سامنے اپنی باغیانہ روش کا اظہار کر دے اور اس کی نصیحتوں کا واضح انکار کر [illegible] الذکر میں ایک قباحت یہ بھی تھی کہ اگر وہ باپ کی صریحاً حکم عدولی کرتا تو [illegible] مرتکب ہونے کی پاداش میں اسے تنہائی کا شکار ہونا پڑتا۔ اس نے اس کے بجائے [illegible] راستہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ والد ماجد کی پیروی کرنے کے بجائے اسے اپنے [illegible] افکار کا گرویدہ بنا لیا۔ باپ نے جب تحریک آزادی اور انقلابی سرگرمیوں کے [illegible] بیٹے کے جذبات دیکھے تو تذبذب کا شکار ہو گیا۔ لیکن بیٹے کی منطق اور توجیہات [illegible] رعنائی اور جاذبیت نہیں تھی کہ باپ کو مکمل طور پر قائل کر پاتا۔ جب باپ نے بنفس [illegible] گرد و پیش کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ اس کا بیٹا تنہا ہی منزل کا راہی نہیں بلکہ یہاں تو [illegible] کارواں آمادہ سفر ہو چکے ہیں۔ یہاں تو فکر و عمل کی دنیا ہی بدل چکی ہے۔ اس طرح [illegible] شخصیت کا توازن کھو بیٹھا۔ وہ بیٹے کو شکار کرنے آیا تھا لیکن خود ہی شکار ہو گیا۔

[illegible] تذبذب اور سوچ و بچار کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب زندہ رہے گا تو بیٹے کے [illegible] اور اگر مرے گا تو بیٹے کے ساتھ۔ ان میں ذہنی خلیج بڑھنے کے بجائے پُر ہو گئی۔ باپ [illegible] روایتی اقدار کو دفن کر دیا اور زندگی کی نئی راہوں پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ تحریک آزادی [illegible] قطع نظر جب ہم کیوبا کے انقلاب کا جائزہ لیتے ہی تو وہاں بھی یہی جذبہ کارفرما [illegible] ہے کہ کس طرح باپ بیٹے نے مل کر جنگ آزادی لڑی اور استعمار کا خاتمہ کر کے [illegible] عظیم رہنما فیڈیل کاسترو کی قیادت میں انقلاب برپا کیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب سیاسی سطح پر معاشرہ اس قدر بڑی تبدیلی کیلئے [illegible] لے رہا تھا باپ نے اپنی پدری روایت نہیں چھوڑی بلکہ بدلتے ہوئے حالات میں بھی [illegible] کفالت خاندان پر اپنی شفقت رکھی اور انہیں ہر قدم پر اپنی نوازشات اور تجربات سے [illegible] طرح نوازا۔ جب والد نے دیکھا کہ اس کا بیٹا خاندانی خوشیوں کو خیر باد کہہ کر مجاہدین

کے گروہ کے ساتھ مل گیا ہے تو اس نے اپنے بیٹے کو اس قدر معقول اور سبق آموز نصیحتیں
کہ اگر وہ خود میدان کارزار میں جاتا تو انہی اصولوں پر عمل پیرا ہوتا۔ اس نے بیٹے کو تلقین
کہ اے میرے فرزند! جب تو مجاہدین کے ساتھ جائے تو وہاں نظم و ضبط کا بھرپور مظاہرہ
اور کمانڈر کی طرف سے جو مشن ملے اسے پوری توجہ سے سننا اور پھر کمالِ ضبط سے اُسے
جامہ پہنانے کی کوشش کرنا۔ حالانکہ یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ جب ایک شخص مجاہدین
ساتھ ملتا ہے تو اس کے اہل خانہ کی زندگیاں بھی خطرات سے دوچار ہو جاتی ہیں کیونکہ
نواز خفیہ ایجنسیاں معاشرے میں ہونے والی ایک ایک تبدیلی سے باخبر ہوتی ہیں۔ لیکن
باپ کی حوصلہ مندی ہے کہ ایسے حالات میں پڑنے والے بوجھ اور نت نئے چیلنجوں کو
سرے لیتا ہے اور اس تلخ حقیقت کو وقت کا تقاضا سمجھ کر برداشت کر لیتا ہے۔

یہاں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ باپ اور بیٹے دونوں کے مابین کسی
اختلاف دیکھنے میں نہیں آتا۔ ایک قدامت پسند باپ پیچھے کھڑا ہے اور انقلابی بیٹا
رہنمائی کر رہا ہے۔ باپ اپنے بیٹے کے نقش قدم پر چلنے کے لیے پوری طرح مستعد
ہے۔ حالانکہ ایک وقت میں غم روزگار مجبور ہو کر باپ استعمار کے اداروں میں انتظامی فرائض
بھی سرانجام دے چکا ہے اور یہ فرائض کوئی معمولی نوعیت کے نہیں تھے بلکہ انتہائی اہمیت
حامل عہدے (Executive posts) اس کے زیر انتظام رہے۔ وہ پولیس خفیہ
ایجنٹ کے طور پر کام کرتا رہا اور کبھی الیکشن کمیشن جیسے بڑے بڑے عہدوں پر متمکن رہا
جب ایک نئے الجزائر کی تعمیر کا وقت آیا تو باپ نے وقت کے بڑے سے بڑے عہدے
پروا کیے بغیر ہر چیز ٹھکرا دی۔

باپ اور بیٹی کا رشتہ

الجزائر کے خاندانی نظام میں چند خصوصیات بڑی اہمیت کی حامل ہیں اگر ان کا

بذات خود ایک مقالہ بن جائے گا۔ لیکن یہاں ہم اختصار کے ساتھ ان کا
اول یہ کہ الجزائری معاشرے میں لڑکے کو لڑکی کی نسبت زیادہ اہمیت دی
خاص طور پر یہ زرعی کلچر کے حامل تمام معاشروں کی خصوصیت ہے کہ ذرائع
کا قبضہ و تسلط ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا طرز زندگی جاگیردارانہ قسم کا ہوتا
بات بھی قابل ذکر ہے کہ خاندان میں بیٹی کی بجائے بیٹے کی ولادت ہو تو پوری
خوشیاں منائی جاتی ہیں کیونکہ بیٹے کی صورت میں باپ کو امید ہوتی ہے کہ وہ
کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹائے گا، اس کا جانشین بنے گا اور والد کی ناگہانی موت کی
اپنی ماں اور بہنوں کا ولی (Gardian) ثابت ہوگا اور مشکل حالات میں اپنے
کی کفالت کا بوجھ بخوبی اٹھا لے گا۔ اس کے برعکس لڑکی کو اپنی شخصیت نکھارنے کے
خاص مواقع فراہم نہیں کیے جاتے اور نہ ہی اس سلسلے میں اسے کوئی پیشرفت کرنے
ہوتی ہے۔ بلکہ وہ ایک قدامت پرست معاشرے کے قائم کردہ اصولوں پر سختی
پیرا ہونے کی پابند ہوتی ہے۔ اس کا کام صرف اور صرف گھر میں رہنا ہے اور
سے رائج الوقت نظام کی پاسداری کرنا ہے۔ ایک استعمارزدہ معاشرے میں یہ
بندھن اور بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں اور عورتوں کی غربت جہالت اور پسماندگی
انتہا پر پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح جب بچی اپنی ماں کی گود میں پروان چڑھتی ہے تو ماں
تربیت روایتی انداز میں کرتی ہے اور اس کے ذہن میں یہ بات دھیرے دھیرے
جاتی ہے کہ بیرونی دنیا کے کام لڑکوں کو مبارک ہوں تمہارا کام ایک پاک دامن بیٹی کی
گھر کی چار دیواری میں رہنا ہے۔ اس طرح لڑکی جوں جوں اپنے عنفوان شباب کی
بڑھتی ہے تو انہیں اس بات کا مزید احساس دلایا جاتا ہے کہ مردوں کی عزت کرنا اس
ہے خواہ وہ بھائی، باپ یا چچا اور ماموں کی صورت میں ہو۔ ان کا احترام و تکریم
لازمی ہے۔ اسی طرح لڑکی کو مردوں کے ساتھ برسرعام اور دیدہ دلیری سے گفتگو

کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور جب وہ سن بلوغت کو پہنچ کر وہ شادی کے قابل ہوتی
اسے خاندان کے کسی لڑکے کے ساتھ ازدواجی بندھن میں باندھ دیا جاتا ہے۔ لیکن ا
سسرال میں جا کر بھی اسے برابری نصیب نہیں ہوتی بلکہ خاوند کو مجازی خدا قرار دے کر تما
فرائض لڑکی کے سر تھوپ دیئے جاتے ہیں۔ مزید برآں جب اپنے خاوند کے ساتھ تناز
صورت میں اس کے سر پر طلاق کی ننگی تلوار لٹک رہی ہوتی ہے۔

ویسے بھی باپ کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ لڑکی میں نفسیاتی اور جسما
حوالے سے کیا تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ویسے بھی والد کی کوشش ہوتی ہے کہ لڑکی
معاشرے میں ہونے والے معاملات سے بالکل بے خبر ہی رکھا جائے۔ اس لیے وہ دگ
اہل خانہ کے ساتھ مل کر یہ سلسلہ جاری رکھتا ہے کہ لڑکی کے بہتر مستقبل کے بارے میں عم
اقدامات کرے۔ اس کے علاوہ الجزائری معاشرے میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل
کہ لڑکی کی شادی کم عمری میں نہ کی جائے بلکہ جب وہ اچھی خاصی بڑی عمر کی ہو جائے ا
ظاہری شکل وصورت میں عورت لگنے لگے تو اہل خانہ کی کوشش ہوتی ہے کہ اب وہ تنہا ر
کے بجائے معاشرے کا باقاعدہ حصے بنے اور یہ کہ اس کے اہل وعیال ہونے چاہئیں تا ک
اس کا احساس تنہائی دور ہو سکے۔ فطری بات ہے کہ اس کی شخصیت کی تکمیل کے لیے یہ با
ضروری ہے۔

اس سطح پر ضروری ہے کہ لڑکی کو اپنی پسند وناپسند کا حق دیا جائے یعنی جس لڑکے ک
ساتھ اسے ازدواجی بندھن میں باندھا جا رہا ہے وہ اس کی پسندیدہ شخصیت ہونا چاہ
لیکن یہاں بھی عورت معاشرتی بندھنوں میں بری طرح بندھی ہوئی ہے۔ وہ ایک چیز
چاہتے ہوئے بھی نہیں پا سکتی۔ کیونکہ اگر وہ اپنے والدین کے پسندیدہ لڑکے کو رد کرتی ہے ا
اس کے ساتھ رشتہ ازدواج میں باندھنے کے لیے چنا گیا ہے تو یہ چیز خود اس کے والد
کے لیے حد درجہ پریشانی وپشیمانی کا سبب بنے گی۔ یعنی ان کے ذہنی اضطراب میں اضا

اور وہ اپنی بیٹی کو اپنے لیے بوجھ تصور کریں گے۔

اس کے علاوہ یہاں ایک قابل ذکر بات ہے کہ مغرب میں ایک لڑکی تین مراحل
(Stages) سے گزرتی ہے یعنی بچپن، بلوغت اور شادی لیکن الجزائر جیسے قدیم معاشرے
میں یہ مراحل تین کے بجائے دو ہوتے ہیں یعنی بچپن بلوغت اور پھر شادی۔ مزید یہ کہ
غربت اور بے روزگاری الجزائری معاشرے کا خاصہ ہیں۔ معاشرتی رواجوں کے مطابق
جب ایک لڑکی سولہ سال کی عمر کو پہنچتی ہے تو اس کے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنی خاندانی
روایات کے مطابق کسی نوجوان لڑکے کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھ جائے لیکن یہ لڑکا اس کی
پسند کے بجائے والدین کی پسند ہوتا ہے جنہوں نے اسے اپنے معیارات کے مطابق پرکھ کر
چنا ہوتا ہے۔

روایتی انداز کے مطابق ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ لڑکی اپنے خاندان والوں کی
مرضی کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرنا چاہتی کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی جاتی
ہے۔ ویسے بھی یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ بچی کے والد عمر کے آخری حصہ میں ہونے کی وجہ
سے خاصے پریشان رہنے لگتے ہیں اور اہل خانہ کو اس بات کی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اگر وہ
رضائے الٰہی سے خدا کو پیارے ہو گئے تو ان کی بیٹی کا کیا بنے گا؟ یعنی اگر وہ اسے بیاہے بغیر
دنیائے فانی سے کوچ کر گئے تو نہ جانے لڑکی کو بعد ازاں کیسے کیسے مسائل اور دشواریوں کا
سامنا کرنا پڑے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ جیتے جی بچی کو کسی مضبوط سہارے کے ساتھ منسلک کر
دیا جائے جو اس کی نفسیاتی وجذباتی اور مادی ضروریات کی تشفی کرنے کا اہل ہو۔

لیکن یہ لبریشن فرنٹ کا طرۂ امتیاز ہے کہ جب تحریک آزادی شروع ہوئی اور روایتی
عورت نے وقت کے تقاضوں کے مطابق مجاہدین کا ساتھ دینے کے لیے اپنا نقاب اتارا تو
اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ذہن پر پڑے ہوئے پردوں کو بھی خیر باد کر دیا۔ جب وہ
بازاروں میں چلتی تو بظاہر ہر کوئی اسے اپنی پُر ہوس نظر کا نشانہ بناتا لیکن اسے کیا خبر کہ اس لڑکی

کے بیگ میں چھوٹی مشین گن، کارتوس، ہینڈ گرنیڈ اور دودھاری خنجر ہے۔ لبریشن تحریک عورت کے لیے رحمت ثابت ہوتی اور عورت تحریک کے لیے جذبہ اور محرک۔ یہاں الجزائری خاتون نے دوہرا کردار ادا کیا۔ ایک طرف اس نے معاشرتی بندھنوں، نام نہاد روایات اور فرسودہ خیالات سے آزادی حاصل کر لی اور دوسری جانب مجاہدین کے ساتھ مل کر استعمار کے خلاف پنجہ آزمائی شروع کر دی۔ اب وہ اپنی روشن فکری اور مجاہدانہ سرگرمیوں کی بدولت استعمار دشمن قوت بن کر ابھری۔ اس کے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا کہ مغرب کے خونی پنجوں سے آزاد ایک آزاد الجزائر کا قیام۔۔۔ ایک نئے وطن کا قیام۔۔۔ تخلیقی قوتوں کے حامل مسکن کا قیام۔۔۔ جمال وجلال کے حامل اداروں کا قیام۔ اس نے تخلیق کائنات میں اپنی ذمہ داری پہچان لی اور الجزائر کی نئی تاریخ رقم کرنے کی ٹھان لی۔

1954ء سے قبل الجزائر میں خواتین کے متعلق عجیب وغریب قسم کی کہانیاں گھڑی گئیں کہ کس طرح استعمارانہ پولیس نے خواتین کی بہت بڑی تعداد کو گرفتار کر کے پس دیوار زنداں ڈالا اور پھر انہیں انتہائی بے رحمی سے تشدد کا نشانہ بنایا۔ لیکن اب یہ قنوطی سوچ (Pessimistic approach) رجائیت (optimism) میں تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ نوجوان لڑکیاں جن کے سامنے تذبذب اور بے یقینی کی صورت حال تھی، ان کے سامنے غربت، بے روزگاری اور شادی جیسے بھیانک مسائل تھے۔ انہوں نے عائلی زندگی کے بجائے عملی زندگی کو ترجیح دی۔ الجزائر سے تعلق رکھنے والی، شرمیلی اور بے بس لڑکی نے اپنے آپ کو مسلح کر لیا۔ اب وہ لڑکی یا عورت نہیں ایک بہن بن گئی۔ (بائیں بازو کی پارٹیاں اپنی تحریک کے دست و بازو بننے والے لڑکے کو ساتھی (Comrade) اور لڑکیوں کو بہن (Sister) کے نام سے پکارتے ہیں) لبریشن فرنٹ نے عورت کے جذبوں کی قدر کرتے ہوئے ان کی بھرتی (Recuitment) کے لیے نئے مراکز کھولے۔ شروع میں ممبر شپ کے لیے عورتوں کی لائنیں لگ گئیں اور تحریک کو توقع سے زیادہ اہمیت (Coverage) ملی۔

[illegible] کے جم غفیر نے تحریک کے مرکز کا رخ کر لیا۔ انتظامی امور کو کنٹرول کرنا کارکنوں [illegible] سے باہر ہو گیا۔ قیادت کو خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں خواتین کا شوق ذوق اور جذبہ جستجو [illegible] پولیس باخبر نہ ہو جائے۔ کیونکہ یہ چیز تحریک کو فائدہ پہنچانے کے بجائے کسی بڑے نقصان سے دوچار کر سکتی تھی۔ بہر حال خواتین کو محاذ جنگ پر بھیجنے کے لیے ابتدائی [illegible] کا اہتمام کیا گیا جو کہ انہوں نے بڑی دلجمعی اور جانفشانی سے مکمل کیا۔ تحریک آزادی کی ہر لڑکی دشمن کے خلاف بڑی سے بڑی مہم سر کرنے کے لیے تیار تھی۔ ان میں سے ہر [illegible] تقاضا کر رہی تھی اسے مشکل ترین خطروں سے کھیلنے کا ہدف سونپا جائے۔

اس کے بعد تحریک ایک نئی صورت حال سے دوچار ہو گئی۔ لڑکیوں کے بارے میں [illegible]ات پیدا ہونے لگے کہ خفیہ پولیس اہلکاران لڑکیوں کو گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنائیں گے۔ مرکزی قیادت نے اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ ممبر [illegible] جدوجہد کے لیے تنظیم کی ممبر بننے والی لڑکیاں ٹریننگ سنٹروں سے باہر نہیں جائیں گی [illegible] اپنے فرائض سینٹروں کی حدود میں رہ کر انجام دیں گی۔ اب لڑکی علی الصبح اٹھنے کے بعد [illegible]وں والا لباس زیب تن کر کے ٹریننگ سنٹر چلی جاتی۔ والدین اس کے جذبہ حریت کے [illegible] کوئی اعتراض نہ کر سکتے تھے۔ لیکن یہ بات ان کے لیے خاصی پریشانی کا باعث بنی۔ مرکزی قیادت نے یہ حکم جاری کر دیا کہ خواتین قوم کے بطل حریت بننے کے لیے اپنا دلیرانہ کردار ادا کریں لیکن اپنے والدین کے لیے کسی طرح کی پریشانی کا سبب نہ بنیں۔ اس فیصلے کے بعد والدین کے ذہنوں سے یہ خوف جاتا رہا۔ تحریک آزادی کی ممبر نوجوان لڑکیوں نے [illegible] نسوانی کمزوریاں چھوڑ دیں۔ عشوہ طرازیاں، وہ دلبریاں، وہ رعنائیاں وہ حسن و جمال کی آرائش سب کو خیر باد کہہ کر لڑکیوں نے پہاڑوں کا رخ کیا جو گوریلا مجاہدین کے مسکن تھے۔ [illegible] سلطانی کے گنبد پر آشیاں بندی کے بجائے انہوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں کو اپنا مسکن [illegible]۔ وہ چنچل شوخ اور نخرے والی لڑکیاں جو اپنے گھر میں اندھیرے کمرے میں جانے سے

ڈرتی تھیں اب غاروں میں رہنے سے نہ گھبراتیں۔ تحریک آزادی نے ان کے اندر ا
انقلابی روح بیدار کردی۔ 4 ماہ کے بعد جب ایک لڑکی چھٹی پر اپنے اہل خانہ کو ملنے کے
واپس گھر آئی تو اس کے پاس اپنے مشاہدات و تجربات کا ایک دفتر ہوتا جسے وہ اپنی خوا
کے مطابق اپنے اہل خانہ سے تبادلہ خیالات کرتی اور انہیں پُر خطر راستوں کی ہیبت نا
آپ بیتیاں سناتی جسے اس کے اہل خانہ سن کر دنگ رہ جاتے۔

لڑکی کے ساتھ اس کے اہل خانہ کا رویہ یکسر تبدیل ہوگیا۔ وہی والدین جو اسے گ
سے باہر قدم رکھنے سے منع کرتے اب وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پہ پھرتی تھی۔ پہلے عورت ک
ذہن میں انقلاب برپا ہوا۔ وہ مردوں کی ہر بات سے لرزاں و ترساں تھی۔ قبل
ازیں والدین کا ہر حکم اس کیلئے قانون کا درجہ رکھتا تھا لیکن اب حالات تبدیل ہو چکے تھے
پورا معاشرہ استعمار کے خلاف نبرد آزما تھا۔ وقت کا تقاضا تھا کہ جمود کا شکار معاشرتی روایا
کا جوا اپنے کندھوں سے اُتار کر پھینک دیا جائے اور ان کی جگہ حساس، خلاق اور متحرک او
انسان دوست اقدار (Values) متعارف کروائی جائیں تاکہ ان کی بنیادوں پر ایک آزا
وخود مختار معاشرہ وجود میں آسکے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ جنس
تعلقات میں بھی تبدیلی لائی جائے۔ اب عورت مرد پر منحصر نہ رہی۔ اس نے معاشرے میں
اپنی پہچان کے لیے نیا راستہ اختیار کر کے منفرد مقام پیدا کر لیا۔

وہ گوریلا محاذ جنگ پر اپنے ساتھ یادگار تصاویر کا البم لاتی اور اپنے اہل خانہ ک
دکھاتی تاکہ اس سے محظوظ ہوسکیں اور جنگ کی تازہ ترین صورت حال سے آگاہ ہو
سکیں۔ اس طرح وہ اپنی کارروائیوں کے بارے میں بتاتی کہ کس طرح انہوں نے دشمن
فوج کے دستے پر ہلہ بولا، کس طرح ان کے ساتھی شدید زخموں سے چور ہوئے اور کس
طرح انہوں نے دشمنوں کے فوجیوں کو قیدی بنایا وغیرہ وغیرہ۔ اب وہ یہ تمام باتیں ب
جھجک میں اپنے والدین کے ساتھ شانہ بشانہ بیٹھ کر کر سکتی تھی۔ نہ اسے والد کا خوف ہو

ئی ہچکچاہٹ۔ یہ انقلابی جدوجہد کا طرۂ امتیاز ہے کہ اب نہ صرف لڑکی کے
میں انقلاب آیا بلکہ اس کے والد کی شخصیت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ والد
کی بات سن کر تکبر سے منہ نہ پھیرتا، نہ اسے شرم محسوس ہوتی کہ ایک عورت ذات کس
دیدہ دلیری سے اس کے سامنے بات کر رہی ہے نہ اس کے ذہن میں آتا کہ ایک
لڑکی کو اس کی موجودگی میں خاموش رہنا چاہیے۔ بلکہ اس کے بجائے باپ کو ایسے لگتا
اس کی بیٹی کی وجہ سے اس کا تمام گھر جگمگا اٹھتا ہے اس کے آنگن میں روشنی کا سیلاب
آگیا ہے۔ یہ ان تین چھٹیوں کے دوران لڑکی سے تمام افکار و واقعات زیر بحث لاتا
اس نے کبھی بھی ٹریننگ سنٹروں کی اخلاقی صورت حال بارے استفسار نہ کیا، نہ
اپنی بیٹی کی عصمت کے بارے میں شک گزرا۔ یہ سوالات اس کے لیے بے معنی اور
لایعنی ہو چکے تھے۔ بہر حال تحریک آزادی عورت کے لیے ایک رحمت ثابت ہوئی جیسا
کہ ہم اس باب کے آغاز میں واضح کر چکے ہیں کہ اس دوران اس نے دوہرا کردار کیا،
ایک تو معاشرتی جمود اور بیمار قسم کی روایات کو توڑ کر انہیں حقیقت مستحکم کی اور دوسری
جانب اپنے ملک کو استعمار سے آزادی دلانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ المختصر عورت نے
معاشرے کو جمود، بانجھ پن اور غیر اخلاقی اور غیر خلاقی اقدار سے نجات دلانے میں اپنے
آپ کو قربانی کے لیے پیش کر دیا۔

بھائیوں کا باہمی تعلق

ایک روایتی معاشرے میں خاندان زیادہ افراد پر مشتمل ہو تو باپ کے بعد بڑے بھائی
کو سب سے زیادہ فائق سمجھا جاتا ہے۔ والد کے بعد دیگر بہن بھائی اس کے حکم کو سر آنکھوں پر سمجھ
کر اس کا کہنا مانتے ہیں۔ وہ اس کے سامنے بلند آواز میں بات تک نہیں کرتے بلکہ ان کا
رویہ ہچکچاہٹ پر مبنی ہوتا ہے اور اگر کبھی اتفاق سے تمام بھائیوں کو ایک مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق

ہوتو وہ کسی مزاحیہ بات پر اپنے بڑے بھائی کی موجودگی میں قہقہہ نہیں لگاتے۔لیکن تحریک آزادی Liberation Movement نے جس طرح ایک باپ بیٹے اور باپ بیٹی کے تعلقات میں تبدیلی پیدا کی، اس طرح بھائیوں کے باہم تعلقات میں بھی انقلاب برپا کیا۔ تحریک آزادی کا حصہ بننے والے بھائیوں کے مابین اختلافات مٹ گئے۔ان کی ہچکچاہٹ جاتی رہی، ان کی قدامت پسندی دور ہوگئی۔ایک دوسرے کے بارے میں غلط فہمی اور خوف و تذبذب کے جذبات چھٹ گئے۔ بھائیوں نے استعمار کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے اور میدان کارزار میں کندھے سے کندھا ملا کر دشمن سے نبرد آزما ہوگئے۔ دونوں اخوت محبت کے جذبے سے سرشار تھے۔نہ کوئی اونچ تھی نہ نیچ، دونوں برابر لڑے، اس دوران پیش آنے والے دُکھ سُکھ دونوں کے حصے میں آئے۔ جب ایک بھائی لڑائی کے دوران زخموں سے دوچار ہوتا تو دوسرا اسے اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھا کر مرہم پٹی کرتا۔اس کی دلجمعی کرتا اور ڈھارس بندھا کر اسے دوبارہ لڑائی کے لیے آمادہ کرتا۔

اس سے ظاہر ہوگیا کہ انقلابی جدوجہد نے انسان میں کیا تبدیلی پیدا کی۔ جمود کا شکار معاشرے کے دوفرزندوں کے مابین بہت بڑی تبدیلی رونما ہوگئی۔تمام روایتی بندھن توڑ دیے گئے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ چھوٹا بھائی اپنی لیاقت کی وجہ سے کسی گوریلا یونٹ کا کمانڈر بنا دیا جاتا تو بڑا بھائی بلاچون وچرا اس کے حکم کی تعمیل کرتا۔اس کے ذہن میں قدیم بت پاش پاش ہوگئے۔ انقلابی جدوجہد کا حصہ بننے کے بعد ان میں کولہو کے بیل والا رشتہ (Stereotype) ختم ہوگیا۔حق وناحق کے لیے تمام پیمانے تبدیل ہوگئے۔اب بڑا ہر صورت میں درست نہ تھا بلکہ اقدار کی تبدیلی کے بعد فیصلہ چھوٹے بڑے کے بجائے حق کی کسوٹی پر کیا جاتا۔اس طرح جنگ آزادی بھائیوں کے رشتہ کونئی جہت سے روشناس کرانے کے لیے رحمت ثابت ہوئی۔

تحریک آزادی کے دوران خاوند اور اہلیہ کے تعلقات کی نوعیت

اس باب میں مختلف شہ سرخیوں (Headings) کے تحت ہم اس چیز کو ثابت کر چکے ہیں کہ جب ایک قدامت پرست اور زرعی معاشرے میں تحریک آزادی شروع ہوتی ہے تو کس طرح اس معاشرے کے ہر ایک پہلو پر اثر انداز ہوتی ہے۔اس کا مقصد صرف سیاسی اور فوجی جبر کا خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ معاشرے کے معاشی، معاشرتی، تعلیمی، نفسیاتی اور یہاں تک کہ جنسی پہلوؤں کو بھی خواب خرگوش سے بیدار کر کے ان میں نئی روح پھونکنا ہوتی ہے۔جب ہم تحریک آزادی کے دوران خاوند اور اس کی اہلیہ کے مابین رشتے کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ جذباتی رشتہ بھی تبدیلی کی بھینٹ چڑھے بغیر نہیں رہتا۔ حالانکہ ایک قدامت پسند معاشرے میں جب بیوی اور خاوند ایک عمرانی معاہدہ (Social Contract) کرنے کے بعد ایک بندھن میں باندھ دیئے جاتے ہیں تو دونوں پر مختلف ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

اگر تاریخ انسانی کو حقوق وفرائض ہی کا ایک سلسلہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ فرائض حقوق کا معاوضہ ہوتے ہیں اور حقوق فرائض کا ثمرہ۔اسی طرح رشتہ ازدواج میں بندھنے کے بعد خاوند اور بیوی بھی اپنے حقوق وفرائض کا تعین کرتے ہیں۔ایک قدامت پسند معاشرے میں بیوی کو گھریلو اور خاوند کو بیرونی ذمہ داریاں ادا کرنا ہوتی ہیں۔لیکن تحریک آزادی شروع ہونے کے بعد اس رشتے میں عجیب تبدیلی دیکھنے میں آئی۔اس کی ایک واضح مثال ماہر عمرانیات (Socialogist) کے سروے میں ایک زندہ شخص کے کردار میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔28 سالہ مصطفےٰ کی شادی ایک قدامت پسند لڑکی سے ہوجاتی ہے مصطفےٰ اپنی دیگر ذمہ داریوں کے علاوہ ایک روشن فکر آدمی ہے۔اسے فرانسیسی فوج کے ایک عقوبت خانے (Torture Cell) کا پتہ چلتا ہے کہ وہاں اس کے ہم وطنوں کو صبح سے شام تک انتہائی برے طریقے سے زدوکوب کیا جاتا ہے اور ان کے جسم کے مختلف

حصوں کو بری طرح نشانہ بنایا جاتا ہے کہ بعض تو تکلیف کی شدت سے مفلوج ہو جاتے ہیں
۔ وہ رات کو ہینڈ گرنیڈ لے کر نکلتا ہے اور اس عقوبت خانے پر حملہ بول دیتا ہے۔ اس سے
بہت سے فرانسیسی سیکورٹی اہلکار اور چند آفیسر لقمہ اجل بنتے ہیں۔ چند منٹ بعد میڈیا خبر چلا
دیتا ہے کہ باغیوں نے ایک پولیس چوکی پر حملہ کر کے متعدد سیکورٹی گارڈز کو موت کے گھاٹ
اُتار دیا ہے۔ مصطفےٰ یہ کارروائی کرنے کے بعد کامیابی سے اپنے مکان میں آ کر لیٹ جاتا
ہے۔ اس کی بیوی جب ریڈیو الجزائر کی نشریات سنتی ہے تو آ کر مصطفےٰ کو تمام واقعہ سے آگاہ
کرتی ہے جسے وہ سننے کے بعد خاموش رہتا ہے۔ اس بے چاری کو کیا خبر کہ جسے وہ مجاہدین
کے حملے کی روداد سنا رہی ہے اس کا سرغنہ خود اس کا خاوند مصطفےٰ ہے۔ اس کے علاوہ ان کے
ہمسایہ میں رہنے والا ایک شخص دشمن کی گرفت میں آ جاتا ہے جو عقوبت خانے میں اسے زدو
کوب کرتے ہیں۔ وہ موقع پا کر عقوبت خانے کی تصاویر اپنے گھر والوں کو بھیجتا ہے جسے
دیکھنے کے بعد اہل خانہ کے دلوں پر قیامت بیت جاتی ہے۔ جب مصطفےٰ کی بیوی ان
تصویروں کا مشاہدہ کرتی ہے تو آ کر اپنے خاوند کو بزدل ہونے کا طعنہ دیتی ہے کہ تمہارے
بھائی دشمن کی جیلوں میں ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور تم اپنی دنیاوی خوشیوں میں
پڑے ہوئے ہو۔

اس واقعہ کا اگر نفسیاتی طور پر جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواتین نے
اپنے شوہروں کو بزدل ہونے کا طعنہ دے کر انہیں خوابِ خرگوش سے جگایا اور میدان کارزار
میں کودنے کا حوصلہ دیا۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ اگر کوئی مرد اپنے کسی دوست کو بزدل
ہونے کا طعنہ دے تو وہ اسے ہنس کر نظر انداز کر دیتا ہے یا پھر اسے اپنے اعمال کی توجیہات
سے آگاہ کرتا ہے۔ لیکن ایک قدامت پسند معاشرے میں عورت کا مرد کو بزدل ہونے کا
طعنہ دینا زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ اور آزادیٔ الجزائر کی جنگ میں اسی جذبے نے کام کیا۔
اس سے بڑھ کر جب نوجوان لڑکیاں خود محاذ جنگ پر غازیوں کے ساتھ لڑنے مرنے پر تیار

ہوئیں تو ان کے کردار میں ایک عجیب جذبہ پیدا ہوا۔ جب خاندانی روایات کے مطابق لڑکی
کی شادی کا معاملہ پیش آیا تو اس نے ایسے شخص کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو لبریشن فرنٹ
کا ممبر نہ ہو یا یہ کہ اس نے کسی گوریلا کیمپ میں کمانڈو تربیت حاصل نہ کی ہو۔

عورت نے اس جذبے کی بنا پر اپنے خاوند میں جذبہ حب الوطنی پیدا کر دیا۔ اب یہ
وقت آ گیا کہ مردوں نے ہنگامی طور پر پستول رکھنا شروع کر دیا۔ کوئی عورت یہ منظر دیکھتی تو
خفا ہونے کے بجائے اپنے خاوند کی بہادری پر باغ باغ ہو جاتی۔ جب کوئی شخص فدائی
کارروائی کر کے واپس آتا تو اس کی بیوی مجاہد خاوند کے معاملات کی روداد سننے میں پوری
دلچسپی کا اظہار کرتی۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ عورت اس سے تقاضا کرتی کہ وہ اپنے چند
دوستوں کے نام اور دیگر لوازمات سے اسے باخبر رکھے تاکہ ناگہاں گرفتاری کی صورت میں
وہ ان سے رابطہ کر کے اطمینان حاصل کر سکے۔ تحریک آزادی کے دوران بارہا ایسا ہوا کہ
ایک شخص نے گرفتار ہونے پر دشمن کی خفیہ پولیس کو اپنے تمام ساتھیوں کے نام پتے بتا دیئے
جس سے پورا نیٹ ورک دشمن کے ہاتھوں چڑھ گیا جو کہ انقلابی تحریک کے لیے ناقابل تلافی
نقصان تھا۔ اس طرح انقلابی افکار کی علمبردار عورت اپنے خاوند کو کسی مشن پر جانے سے قبل
نصیحت کرتی کہ اگر تم مہم کے دوران گرفتار ہو جاؤ تو تحقیق کے دوران بات صیغۂ راز میں رکھنا
اور کسی قریبی ساتھی یا ان کے اہل خانہ کے نام و دیگر لوازمات دشمن کے علم میں نہ لانا۔

اسی طرح جب خاوند کسی دور دراز مقام پر واقع گوریلا کیمپ میں ٹریننگ کرتا یا
محاذ جنگ پر اپنے فرائض سرانجام دینے کے بعد عارضی چھٹی پر آتا تو عورت اپنے انقلابی
شوہر کو دیکھ کر حد درجہ خوش ہوتی۔ دونوں اپنے گزر اوقات اور دکھ وسکھ کے بارے میں ایک
دوسرے کو آگاہ کرتے۔ بعض اوقات حسن و جمال کی رنگینیوں اور خیابانوں کی دلبریوں سے
متاثر ہو کر خاوند واپس فدائی مشن پر جانے میں پس و پیش کرتا تو خاتون حُر اسے حوصلہ دیتی
اور مرغزاروں کو چھوڑ کر جہاد کے میدانوں کا رخ کرنے پر اکساتی۔ بعض اوقات گفتگو کے

دوران قنوطی ماحول بھی پیدا ہوتا اور خاوند اپنی بیوی سے کہتا کہ اگر میں محاذ جنگ پر دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا یا مارا گیا تو تم پریشان نہ ہونا۔اس لمحے عورت ایک عظیم دختر ملت کا کردار ادا کرتی۔نہ اس کے قدم ڈگمگاتے نہ اس کے ارادے متزلزل ہوتے بلکہ اس بار وہ کہتی جب پورا ملک غلامی کی گود میں سسک رہا ہے تو ہماری پُرتعیش زندگی کا کیا مقصد ہے۔لہٰذا جب تک تم وطن عزیز کی آزادی واپس نہیں لاتے اور دشمن کی جیلوں میں چند اپنے ساتھیوں کو آزاد نہیں کروالیتے،اس وقت تمہاری انفرادی آزادی اور خوشی بے معنی ہے وغیرہ وغیرہ۔

بعض اوقات عورتوں نے تحریک آزادی میں اس قدر جانفشانی سے کام کیا کہ تاریخ اس طرح کی مثالیں پیش کرنے سے عاجز ہے۔ایسی خواتین جن کے ہاں اولاد نہیں تھی یا ابھی نئی نئی رشتہ ازدواج میں بندھی تھیں،انہوں نے اپنے خاوندوں کے ساتھ محاذ جنگ پر جانے کو ترجیح دی۔سروے کے مطابق مجاہد کیمپوں میں ایسا بھی ہوا کہ جب کسی عورت کا خاوند جنگ کے دوران مارا جاتا تو وہ دلبرداشتہ ہوکر اپنے گھر رہنے کے بجائے اپنے والدین کے پاس چلی جاتی۔لیکن بعض خواتین اپنے مشن کے ساتھ اس قدر وفادار ثابت ہوئیں کہ جب ان میں سے کسی کا شوہر داغ مفارقت دے جاتا تو وہ ٹریننگ سنٹر سے واپسی کے بجائے محاذ جنگ پر اپنے فرائض سرانجام دینے کو ترجیح دیتی۔اس کے کردار میں اس قدر پاکیزگی آگئی کہ جب وہ اپنے ذاتی گھر میں تھی تو گھر کی نگہداشت اور خاوند کی وفاداری اس کا منشور تھا۔وہ اپنی جمالیاتی سرگرمیوں سے گھر کو ہر وقت جنت کا نمونہ بنانے کے درپے رہتی لیکن جب محاذ جنگ پر پہنچی تو اپنی تمام تر نسوانی کمزوریوں پر قابو پاکر اپنے مجاہد ساتھیوں کی خدمت پر کمربستہ ہوگئی۔اس نے دن دیکھا نہ رات،نہ کوئی مشکل اس کے آڑے آئی،نہ کوئی مایوسی اس کے دامن سے لپٹی۔وہ ہر وقت اپنے کام سے کام رکھتی،کہیں کھانا پکانے کی سرگرمیاں کہیں جہادی سنٹر کی صفائی کا کام،کہیں بیماروں کی تیمارداری،کہیں زخمیوں کی دیکھ بھال،المختصر ہر وقت اس کے ذہن میں ایک ہی جذبہ سوار رہتا کہ یا تو تحریک آزادی کو

کامیابی سے ہمکنار کر کے وطن عزیز کو استعمار کے ظلم سے آزاد کرائے گی یا اس وادیٔ پُر خار میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے سرخرو ہوجائے گی۔

اس کے علاوہ ایک قدامت پسند خاندان میں شادیوں کے معاملے میں پسند وناپسند کا معاملہ پیش آجاتا ہے۔جو کہ اکثر اوقات تعلقات میں بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔یا طبیعت کے فرق (Tempermental Contrast) کی وجہ سے دونوں میں نفسیاتی الجھنیں پیدا ہوجاتی ہیں اس کے علاوہ بعض خواتین معاشی بدحالی کی وجہ سے عدم تحفظ کا شکار ہوکر خاوند کے ساتھ ہر وقت الجھتی رہتی ہیں۔خواہ معاشرہ زرعی ہو یا صنعتی،معاشرتی سطح پر یہ مسائل دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔لیکن یہ تحریک آزادیٔ الجزائر کا طرۂ امتیاز ہے کہ خاوند اور بیوی کے مابین اس طرح کی تمام کمزوریاں ختم ہوگئیں،بدگمانیاں دم توڑ گئیں،رقابتیں دور ہوگئیں یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کا حقیقی لباس ثابت ہوئے۔مہر ومحبت،وفاودلگی،ایثار و قربانی جیسے جذبات معاشرتی اور عملی زندگی کا جوہر بن گئے۔یہ وہ تبدیلی تھی کہ اگر دنیا کی بڑی سے بڑی جمہوری اور انسان دوست حکومت قانون کے بل بوتے پر لانا چاہتی تو شاید اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔لیکن الجزائر جیسے پسماندہ معاشرے میں یہ کریڈٹ تحریک آزادی (Liberation Front) کو جاتا ہے۔جس نے سیاسی ومعاشی آزادی کے ساتھ ساتھ عائلی زندگی کو بھی حقیقی آزادی سے ہمکنار کر کے ایک انقلاب برپا کردیا۔

شادی اور طلاق

ایک قدامت پرست معاشرے میں شادی کوئی انفرادی معاہدہ نہیں ہوتا جو ایک شخص اپنی مرضی سے طے کرلے بلکہ یہ ایک اجتماعی بندھن ہوتا ہے وہ ایک جرگہ دوسرے جرگے، ایک خاندان دوسرے خاندان سے جوڑتا ہے۔پیشرفت لڑکے کی طرف سے کی جاتی ہے جو ایک عارضی ملاقات کے دوران لڑکی کا چہرہ دیکھ کر اپنی آمادگی یا انکار کا اظہار کرتا ہے۔اس

کے علاوہ دیگر معاشی و معاشرتی پہلو بھی سامنے رکھے جاتے ہیں۔ ان کا تفصیل کے ساتھ یہاں ذکر نامناسب ہے۔ یہاں صرف اتنا بتانا ضروری ہے کہ تحریک آزادی سے قبل شادیوں کے معاملے میں بڑی سختی تھی۔ ایک جرگہ دوسرے جرگے یا اپنے سے کم حیثیت کے لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ لیکن تحریک آزادی نے جہاں معاشرے کے دیگر اداروں کو متاثر کیا، وہاں شادیوں کے معاملے میں بھی ایک انقلابی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ جہادی سنٹروں میں کام کرنے والے مجاہد اور رضا کار اگر دوران ڈیوٹی کسی نرس یا کارکن کے ساتھ آشنائی حاصل کر لیتے تو فوری طور پر اپنے سربراہ یا فوجی قائد کو اس سے باخبر کرتے۔ شروع شروع میں قیادت نے حد درجہ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا کہ ایک ولی کے بغیر کسی لڑکی کی شادی کا تعین کیسے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن محبت ایک ناقابل تردید جذبہ ہے جب یہ دل میں پیدا ہوتا ہے تو اپنی تشفی کیے بغیر دبایا نہیں جا سکتا۔ انقلابی قیادت نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اس جمود کو بھی انقلابی روح کے مطابق توڑ دیا اور حکم جاری کیا کہ اگر لڑکا لڑکی دونوں رشتہ ازدواج میں بندھنے پر رضامند ہوں تو انہیں ایسا کرنے کی اجازت ہوگی اور اس کام کیلئے مجسٹریٹ یا عدالت کے سامنے بیان دینے کی کوئی پابندی نہیں۔

جب جہادی کیمپوں (Inaquates) میں یہ کام بڑھ گیا تو انقلابی قیادت نے کیمپوں میں شادیاں کرنے پر پابندی عائد کر دی لیکن اس جذبہ کی قدر کرتے ہوئے رجسٹریشن سنٹر کھولے گئے۔ یہ ادارے بغیر کسی معاوضے کے رضا کارانہ طور پر اپنے فرائض سرانجام دیتے۔ یہاں لڑکا کسی دختر اسلام سے شادی کی باقاعدہ درخواست دیتا۔ بعدازاں منظوری کی صورت میں اسے لڑکی کی تصویر دکھائی جاتی اور ملاقات کا موقع بھی فراہم کیا جاتا تاکہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں اچھی طرح جانکاری کر سکیں۔ ایک دوسرے کا مزاج اور دیگر عادات و اطوار معلوم کر سکیں۔ زیادہ سے زیادہ کسی شادی پر اگر اعتراض بھی کیا جاتا تو اسے صرف تین ماہ تک روکنے کی اجازت تھی۔ اسی طرح اگر کسی خاندان کو معلوم ہوتا کہ

جہادی کیمپ میں ان کی بیٹی نے شادی کر لی ہے تو یہ بات اہل خانہ، خاص طور پر لڑکی کے باپ کے لیے بجلی بن کر نہ گرتی۔ وہ اسے ٹھنڈے دماغ سے برداشت کر لیتا کیونکہ اب اس کے مطمع نظر میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ رشتہ ازدواج قائم ہونے کے بعد اگر نئے جوڑے کے ہمراہ کوئی بچہ یا بچی جنم لیتا تو اسے اپنے دادا یا دادی کے ہاں پرورش کے لیے بھجوا دیا جاتا تاکہ جہادی پوری تندہی سے محاذ جنگ پر اپنے فرائض سرانجام دے سکیں۔

طلاق کے معاملے میں بھی لبریشن فرنٹ کی انقلابی قیادت نے بے مثال اقدامات کیے۔ الجزائر جیسے قدامت پرست معاشرے میں طلاق دینا معیوب تو نہ تھا لیکن اس میں بعض قباحتیں پائی جاتی تھیں۔ لبریشن فرنٹ نے جب استعمار کے خلاف اعلان جہاد کیا تو جہاں معاشرے کے دیگر پہلوؤں میں تبدیلی رونما ہوئی وہاں طلاق کے معاملے میں بھی مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ اب اگر خاوند اور اس کی اہلیہ کے مابین کوئی جھگڑا یا غلط فہمی رونما ہو بھی جاتی تو اسے فوراً طلاق دینے کی اجازت نہ ہوتی۔ اس سلسلے میں لبریشن فرنٹ نے مصالحتی کمیشن (Mediation Commission) قائم کیا جو طرفین کا موقف سنتا، وجہ نزاع معلوم کرتا اور دونوں میں سے اگر کسی کو کوتاہی کا ذمہ دار پاتا تو اپنی خامی دور کرنے پر آمادہ کرتا، خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ استعمار نے معاشرتی وحدت کو توڑنے کے لیے تمام حربے استعمال کیے لیکن معاشرہ اپنی متحرک اور خلاق (Dynamic) قوت مزاحمت کے ساتھ اپنے آپ کو مزید مستحکم بنیادوں پہ استوار کرتا چلا گیا۔ انقلابی کمان نے وقت کے تقاضوں کے مطابق اس قدر احسن اور ٹھوس اقدامات کیے کہ ان سے غلامی کی زنجیریں ٹوٹتی چلی گئیں اور انسان اپنے معاملات اور دائرہ کار کے حوالے سے مزید خودمختار ہوتا چلا گیا۔

تحریک آزادی کا حصہ بننے کے بعد عورت کے کردار میں ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ جب استعمار نے الجزائر کے لوگوں پر جنگ مسلط کی تو سارا ملک جنگ آزادی میں حصہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، نئے نئے مسائل جنم لیتے گئے اور انقلابی

قیادت نے اپنے حسن عمل اور عزم مصمم سے ان پر قابو پانے کے لیے نئی نئی راہیں سلجھائیں۔

تحریک آزادی سے قبل عورت مکمل طور پر اپنے گھر کی چار دیواری میں بند تھی۔ وہ صرف جمعتہ المبارک کے روز اجتماعی عبادت میں شرکت کیلئے جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے کسی بھی موقع پر گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو معاشرے نے انگڑائی لی اور عورت نے تحریک آزادی کا حصہ بننے کی پیش کش کی تو ملک بھر سے لاکھوں خواتین ٹرینی کیمپوں میں جمع ہو گئیں۔ ملک کے کونے کونے سے اکٹھی ہونے والی خواتین نے آپس میں تبادلہ خیالات کیے۔ اس دوران ان تمام مسائل اور جبر و کرب (Repression) کو زیر بحث لایا گیا جو انہیں معاشرتی زندگی کا حصہ بننے کے بعد برداشت کرنا پڑتے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے زندان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے طریقوں اور حکمت عملی پر بھی غور کیا جو ان کے لیے امید کی کرن تھی۔ اپنے خاوند سے دور ہو کر عورت کے سامنے ایک نئی دنیا کھلی۔ یہ پھولوں کی سیج نہیں بلکہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا تھا۔ اس نے غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے اپنے حصے کی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور شب و روز مجاہدین کے شانہ بشانہ دشمنوں کے خلاف معرکہ آرائی میں مصروف رہتی۔ اس طرح اہلیہ خاوند سے دور تربیتی کیمپوں میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو گئی۔ اس نے یتیم بچوں کی پرورش کا ذمہ لیا، بیماروں کی تیمارداری کی، زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔ اس نے دیگر جمالیاتی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ اس نے اپنے آپ کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ یتیم بچوں، بیواؤں اور مجاہدین کے تن ڈھانپنے کے جذبے نے اسے سلائی کے کام پر اکسایا۔ اس نے اپنے کمال فن اور حسن ذوق سے یہ کام انتہائی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔

الجزائر کے خلاف فرانسیسی جنگ نے پورے کا پورا سیٹ اپ منتشر کر کے رکھ دیا۔ وہ چھوٹا سا گاؤں (Mechta) جہاں کاروان زندگی روایتی انداز میں رواں دواں تھا، تباہ ہو کر رہ گیا۔ فرانسیسی جنگی طیاروں کی مسلسل بمباری اور جارحانہ حملوں سے لاکھوں لوگ نقل

مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ نوجوان دشمن کے خلاف پنجہ آزمائی کرنے کے لیے پہاڑوں میں جا چھپے۔ اب پیچھے چند لوگ رہ گئے لیکن انہوں نے اپنے حصے میں آنے والی ذمہ داریوں سے فرار اختیار نہ کیا بلکہ انہیں پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بچے کھچے وسائل کو زیر استعمال لائے۔ شہید ہونے والوں کی تدفین و تکفین کا کام سرعت رفتاری کے ساتھ کیا گیا لیکن پھر بھی دشمن کو صبر نہ آیا اور نہتے لوگوں کے خلاف جارحیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ لوگ جو معاشرتی تبدیلی کے لیے کوئی خصوصی کردار ادا کرنے کے قابل نہ تھے، نقل مکانی کر کے اپنے ہمسایہ گاؤں میں چلے گئے۔ بعض نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے پاس پناہ لینے کو ترجیح دی۔

اب گاؤں کا نقشہ مکمل طور پر تبدیل ہو گیا۔ یہ ایک گاؤں نہ تھا، کھنڈر تھا۔ یہاں ماضی کی کوئی یادگار نہ بچی، صرف مردوں، عورتوں اور بچوں کا انبوہ تھا۔ سامراج نے دیہاتوں کو جیلوں سے بدل دیا۔ ان لوگوں کو اپنی روایت کے مطابق نہ کھانے کو کچھ ملتا نہ انہیں رات گزارنے کے لیے مناسب جگہ میسر تھی۔ جسے جہاں جگہ ملتی سو جاتا۔ لوگوں کی زندگی مکمل طور پر تبدیل ہو چکی تھی۔ یہاں ہم ایک واقع کا ذکر کرتے ہیں جو ہمارے مفروضے کی تکمیل کے لیے کافی ہے۔ ایک دفعہ کیمپ میں ایک آدمی وفات پا گیا۔ الجزائری معاشرے میں کسی کی وفات پر صف ماتم بچھ جاتی۔ لیکن جنگ کے بعد صورت حال مکمل طور پر تبدیل ہو گئی۔ نہ کسی نے فرط غم سے آنسو بہائے، نہ آہ و بکا کی، نہ لمبی لمبی چیخیں اور بین کر کے دوسرے لوگوں کو رلانے پر مجبور کیا بلکہ صبر و استقلال کا دامن تھام کر اسے وقت کا تقاضا سمجھ کر صدق دل سے قبول کیا۔

ایک مرتبہ یوں ہوا کہ دشمن کے جہازوں نے ایک گاؤں پر شدید بمباری کر کے متعدد افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ گاؤں کے لوگوں نے اپنے روایتی طرز عمل کے برعکس فوری طور پر سڑک کے کنارے گڑھا کھود کر ان مسخ شدہ لاشوں کو دفن کر دیا۔ نہ کوئی شور و غل سننے

میں آیا نہ کوئی ماتم دیکھنے میں آیا۔ جنگ آزادی کی وجہ سے لوگوں میں حد درجہ تحمل اور
بردباری پیدا ہو چکی تھی۔ خواہ ان کے سامنے سینکڑوں ہلاکتیں واقع ہو جائیں، لوگ آہ وبکا
کرنے کے بجائے پُروقار طریقے سے آنسو بہا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے۔ وہ رونے
دھونے کے بجائے مرنے والوں کے حق میں اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق دعائے
مغفرت کرتے۔

یہ تحریک آزادی کی پھونکی ہوئی روح کا ہی اثر تھا کہ لوگوں نے شہید ہونے والوں کو
خراج تحسین پیش کرنے کا نیا طریقہ وضع کر لیا۔ یعنی جب کسی شہید کا جسد خاکی متعلقہ گاؤں
میں لایا جاتا تو اسے پورے جاہ وجلال سے سلامی دے کر سپرد خاک کر دیا جاتا، جیسا کہ پیشہ
ور فوج میں وطن عزیز کی خاطر جان دینے والے سپوتوں کو دی جاتی ہے۔ تاہم بیماری یا
حادثے میں مرنے والوں کے غم میں کسی حد تک رونے دھونے کا رواج برقرار رہا کیونکہ اب
لوگوں کی نظر میں مثالی موت وہی تھی جو محاذ جنگ پر وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کا
نذرانہ پیش کر کے حاصل کی جاتی۔ اس کے علاوہ لوگوں کے مطمع نظر میں ایک اور تبدیلی رونما
ہوئی وہ یہ کہ ملک میں ہر طرح کی آفت کا ذمہ دار استعمار کو ٹھہرایا گیا خواہ یہ سامراجی فوج کے
ساتھ براہِ راست معرکہ آرائی کے نتیجے میں واقع ہوئی ہو یا کوئی بیماری یا حادثہ اس کا موجب
بنا ہو، ہر دو صورتوں میں مورد الزام سامراج کو ہی ٹھہرایا جاتا۔ ان حالات کے پیش نظر
الجزائر کے لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک وطن عزیز کو استعمار کے قبضے اور غلامی سے
آزاد نہیں کروا لیتے، فرانس کو ناحق لوگوں کے خون خرابے اور قتل وغارت سے بری الذمہ
قرار نہیں دے سکتے۔

✦✦✦✦✦
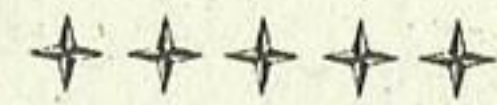
باب چہارم

الجزائر منتشر ہو کر رہ گیا

فرانسیسی سامراج نے الجزائر پر شب خون مارنے کے بعد سب سے پہلے جو حربہ
استعمال کیا وہ انتشار تھا تاکہ لوگ متحد ہو کر اس کے مفادات کے خلاف خطرہ نہ بنیں۔ آغاز
میں قرعہ فال مردوں کے نام نکلا۔ انہیں ہزاروں کی تعداد میں گرفتار کر کے ان سے بیگار لی
گئی۔ 1956ء تک یعنی صرف دو سال کے عرصے میں عقوبت خانوں میں محصور لوگوں کی
تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ لودی، پال، کازیل، بیرونیہ میں مردوں کو کئی سال تک پس دیوار
زنداں رکھا گیا۔ نتیجتاً الجزائر کی خاتون تنہا ہو کر رہ گئی۔ اسے بچوں کی پرورش کے لیے در بدر
کی ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ قبل ازیں حالات خواہ اچھے تھے یا برے، کم از کم اسے اپنے خاوند کا
ساتھ تو حاصل تھا جو اس کے لیے ایک مضبوط سہارے کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ بھی حالات کی ستم
ظریفی نے چھین لیا۔ اب کٹھن حالات کا لمبا سفر تھا، صحرا کی تپتی دھوپ، نہ کوئی پھل نہ سایہ،
نہ ہونٹوں پر آنے والی پیاس بجھانے کے لیے آب حیات۔ الغرض حالات کی تلخی سے
عورت ذلیل وخوار ہو کر رہ گئی۔ جب کبھی صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تو اپنے محبوب خاوند کو ملنے
کے لیے سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے جیل پہنچتی۔ وہاں نہ پا کر وہ جہادی کیمپ کا رخ کرتی۔
لیکن اس سے کیا ہوتا، یہ محض حالات کی تلخی سے فرار اختیار کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ ان

حالات میں لبریشن فرنٹ نے بے بس خواتین اور ان کے بچوں کی پرورش کے لیے امدادی الاؤنس کا انتظام کیا جو ہر ماہ ان بدنصیب عورتوں کے حوالے کر دیا جاتا۔

دشمن نے مقامی لوگوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا۔ کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ روزمرہ کے بڑھتے ہوئے مظالم نے لوگوں کی زندگیاں اجیرن بنا دیں۔ دشمن کے طیاروں کی اندھا دھند بمباری نے شہروں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ زرعی زمینوں پر زہر کا سپرے کر کے لاکھوں ایکڑ کھڑی فصلیں تباہ کر دی گئیں۔ مجبوراً لاکھوں کی تعداد میں لوگ مراکش اور تیونس کے ہمسایہ ممالک کا رخ کرنے لگے۔

الجزائر میں روزمرہ کی قتل و غارت اور استعماری لوٹ مار کے خلاف پوری دنیا میں مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ 1956ء کی بات ہے۔ ان حالات و واقعات کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ کرنے کے لیے ہمیں باریک بینی سے کام لینا ہو گا کیونکہ حقیقت شناسی کے لیے طائرانہ نظر نا کافی ہوتی ہے۔ اس کے بجائے ہمیں الجزائر کے لوگوں کے خلاف ہونے والے مظالم کا جائزہ لینے کے لیے ان کے قدم بقدم چلنا ہو گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فرانسیسی سیکورٹی فورسز کس بے ضمیری سے الجزائر کی ایک عورت کو اٹھا کر لے جاتے ہیں اور اس کی آبرو ریزی کرنے کے بعد اسے واپس گھر بھیج دیتے۔ ظلم و بربریت کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ چند روز بعد یہ سلسلہ مرد کے ساتھ بھی دہرایا جاتا تھا، یعنی ظالم سامراج کے گماشتے خاوند کو گرفتار کر کے اپنے عقوبت خانوں (Torture Cell) میں لے جا کر تشدد کا نشانہ بناتے ہیں اور پھر معمول کے مطابق اس کے گھر چھوڑ جاتے ہیں۔ جسمانی اور روحانی طور پر اس کی حالت

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا می نہم

کی منہ بولتی تصویر ہوتی ہے۔ بظاہر وہ زندہ ہوتا لیکن حقیقت میں ایک زندہ لاش، جس کی

شخصیت بری طرح مسخ کر دی گئی ہو۔ اس پر مزید فرانسیسی فوجیوں نے بچوں کو بے دردی سے گولیوں کا نشانہ بنا کر اپنی ہوس کی آگ بجھائی۔ جو بچ نکلے وہ دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوئے۔ نہ کھانے کو روٹی، نہ زیب تن کرنے کو کپڑا...... پریشان حال...... فاقہ کش...... بے بسی اور محرومیوں کی منہ بولتی تصاویر۔ مزید برآں جب خاوند دشمن کی حراست سے واپس اپنی اہلیہ کے پاس آتا تو دل میں درد، دماغ میں کرب، چہرے پر اداسی، سانسوں میں آہیں لیے وہ اپنی بیوی کو سلام کرتا اور جب گھر کا نقشہ دیکھتا تو در و دیوار سے وحشت کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ بے بس و لاچار ہو کر بیوی کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ جاتا۔ ایک نہیں ہزاروں خاندانوں کے ساتھ ایسا ہوا لیکن جب فرانسیسی وزارت خارجہ عالمی میڈیا پر بیان بازی کرتی تو بے ضمیری سے اپنے جرائم چھپانے کے لیے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈتی۔ خود فرانس کے انسان دوست (Humanist) دانشوروں نے اپنی حکومت کی بربریت کے خلاف آواز بلند کی لیکن وہ بھی ایک مجذوب کی بڑ سمجھ کر سُنی ان سنی کر دی گئی۔

اس طرح کے مظالم قابض فوج کے روزمرہ کے معمولات بن گئے۔ وہی مقامی لوگوں کی کم نصیبی، اور دوسری طرف استعمار کے علمبرداروں کی بے نیازی۔ المختصر الجزائر کا خاندانی نظام تباہ کر کے رکھ دیا گیا۔ اس کی روایات عظمت، محبت و مروت کی لازوال داستانیں قصہ پارینہ بن کر رہ گئیں۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر میرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

کے مصداق ابھی فرانسیسی سامراج کا جی نہ بھرا۔ اُس نے مظالم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا، مجاہدین کی طرف سے اٹھنے والی ہر آواز کو دبانا، ان کی قوت مزاحمت ختم کر کے الجزائر کے وسائل پر مسلسل قابض رہنا۔ 1950ء سے لے کر اب تک یعنی 1956ء تک کوئی ایسا حربہ نہیں جسے دشمن نے نہ آزمایا ہو، کوئی ایسا ظلم نہیں جو نہتے لوگوں

کے خلاف روانہ رکھا گیا ہو۔لیکن

تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

کے مصداق الجزائر کے باسی اب عہد کر چکے ہیں کہ استعمار کی جڑیں اکھاڑ کر ہی دم لیں گے۔ان کے دل میں آزادی کی تمنا بیدار ہو چکی ہے۔وہ تمام مظالم اور بربریت کے باوجود متحد ہیں۔انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ کس طرح استعمار نے ان کے خلاف محاذ آرائی کی اور وہ نام نہاد تہذیب کے علمبرداروں کے ظلم وہوس کا نشانہ بنے۔لیکن انہوں نے مل کر اپنی گردنوں سے غلامی کا جوا اتار پھینکنے کا فیصلہ کیا۔استعمار نے اپنے مضموم مقاصد کی تکمیل کے لیے انہیں جسمانی طور پر منتشر کر دیا لیکن ان کی روحوں کو جدا نہ کر سکا۔

اب وہ بیدار ہو چکے ہیں۔اپنی صفوں میں اتحاد، سینوں میں ایمان، اور ہاتھوں میں ہتھیار اٹھائے وہ استعمار کے خلاف سینہ سپر ہیں تا کہ انقلاب وقت کو کامیابی سے ہمکنار کر کے اپنا شمار زندہ وتابندہ قوموں میں کرواسکیں۔

+++++

باب پنجم

ادویات اور استعمار

سامراج کے علمبرداروں نے الجزائری معاشرے میں جہاں عوام کو ذلت ورسوائی کا تحفہ دیا وہاں ادویات کے معاملے میں بھی انہوں نے دورخا پن یعنی منافقانہ رویہ اپنایا۔یہ دوہرا معیار حقیقت میں وہاں ان کے وجود کا مظہر تھا۔ادویات کے معاملے میں ان لوگوں کے رویہ کی وجہ سے سب سے زیادہ کربناک پہلو سامنے آئے۔

اگر منصفانہ اور حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے ایک ایڈوانس اور ترقی یافتہ ملک اپنے علم وفن اور نت نئی ایجادات کا بہت فائدہ اٹھاتا ہے۔جب کوئی شخص کسی خاص بیماری سے دوچار ہو تو اس کے خلاف منفی رویہ اپنانا بعید از عقل وانصاف ہوتا ہے۔لیکن ایسے حالات میں استعمار کے علمبرداروں کا رویہ ہمیشہ انسان دشمنی پر مبنی ہوتا ہے اور وہ پسے ہوئے غلام لوگوں کو ایسی ذلت آمیز صورت حال سے دوچار کر دیتا ہے کہ وہاں بھی وہ انسان دوستی کے بجائے اپنے ذاتی مفادات کو ترجیح دیتا ہے۔محکوم لوگ ڈاکٹروں، انجینئروں اور سیکورٹی فورسز کے ملازموں کو عجیب صورت حال سے دوچار دیکھتے ہیں کیونکہ اپنی فطری صلاحیت سے بڑھ کر کام کے بوجھ نے انہیں ادھ موا کر دیا ہوتا ہے اور جب وہ کسی قریبی ہسپتال میں لوگوں کا علاج معالجہ

کرنے کے لیے جاتے ہیں تو انتہائی خستہ حالت میں جاتے ہیں۔ ایک مقامی باشندہ بآسانی
اس حقیقت کو پالیتا کہ ڈاکٹر کا تعلق بیرون ملک سے ہے کیونکہ یہ چیز اس سے کردار اور رویے
سے واضح ہو رہی ہوتی ہے۔

جب کوئی غیر ملکی سیاح ملک میں صحت وصفائی کی صورت حال دیکھتا تو اس کے ذہن
میں عجیب سوال پیدا ہونا شروع ہو جاتے۔ لیکن یہاں فرانسیسیوں کا رویہ اس کے بالکل
برعکس ہوتا۔ مثال کے طور پر جب وہ فرانس سے آئے ہوئے کسی ساتھی کو وہاں کی سیر
کرواتے تو اسے سب سے پہلے یہ بتاتے کہ اگر ہم یہاں نہ ہوتے تو نہ جانے اس ملک کی
حالت کیا ہوتی، جو نعمتیں اور آسائشیں یہاں کے لوگوں کو میسر ہیں وہ ہماری ہی مرہون منت
ہیں۔ مقامی شخص کے دل ودماغ میں ہر چیز بٹھائی جاتی اور اس کا مسلسل پراپیگنڈہ کیا جاتا
یہاں تک کہ وہ آزاد ہو کر سوچنے کا متحمل ہی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت اس کے
سامنے مسخ ہو جاتی اور وہ کھوٹے کھرے کی تمیز کرنے میں خود کو بے بس پاتا۔

بعض اوقات معاملہ اس کے برعکس بھی ہو جاتا۔ جب مقامی باشندہ استعماریوں کے
مثبت رویے کا اقرار کرتا اور ان کے ذریعے کیے گئے اچھے اعمال کو تسلیم کرتا تو لامحالہ اس کے
ذہن میں یہ بات آجاتی کہ شاید یہاں بیرونی حملہ آوروں نے قبضہ کر کے ٹھیک ہی کیا ہے۔
کئی مرتبہ مقامی شخص حملہ آوروں کے بچھائے ہوئے جال میں اس قدر بری طرح پھنس جاتا
کہ وہ اپنی زبان سے فرانسیسی شخص کے سامنے اس بات کا اقرار کرتا ''یہ سب تمہارا کرم ہے
آقا'، ورنہ ہم تو کچھ بھی نہ تھے اور اب ہماری خوشحالی اور بقا صرف اسی بات میں مضمر ہے کہ تم
ہمیں بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر نہ جاؤ، اور یہ کہ ہم تمہارے بغیر یہاں کیا کریں گے
وغیرہ وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ استعمار کی بنیاد ہی فوج اور پولیس سسٹم پر ہے اور وہ اپنی بقا کے جواز
کے لیے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ اسے اپنے وجود کی اہمیت کو قانونی جواز فراہم

کرنے کیلئے نہ جانے کون کون سے پاپڑ بیلنا پڑتے۔ جب مقامی شخص اپنی آنکھوں سے یہ
منظر دیکھتا ہے تب اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے یہ مسیحائی نظام اسی سامراج پر قائم
ہے جس کی بنیادیں ظلم واستبداد پر استوار کی گئی ہیں اور اس مسیحائی نظام کو مغرب کے نو
آبادیاتی نظام سے کسی صورت علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ مقامی شخص خود کو اپنے لوگوں سے علیحدہ
تصور نہیں کرتا بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ جو لوگ اپنی سرزمین پر اپنے ہسپتال اور اپنے ڈاکٹروں کے
قیام اور تعیناتی کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے اور اس معاملے میں خود مختاری کے خواہاں تھے، ان کی
سوچ واقعتاً حقیقت پر مبنی تھی۔ اس سطح پر وہ مغربی استعمار کے مہروں کو نظرانداز کر دیتا ہے خواہ
ان کا تعلق طب سے ہو یا انجینئرنگ، درس وتدریس وغیرہ سے۔

ایک آزاد معاشرے میں ڈاکٹر کے ساتھ مریض کا تعلق پُر اعتماد ہوتا ہے۔ مریض کو
ڈاکٹر پر پورا بھروسہ ہوتا ہے کہ اب وہ ایک مسیحا کے بازوؤں میں آگیا ہے اس دوران اگر
اسے درد بھی ہو رہا ہو تو وہ اسے صبر سے برداشت کر لیتا ہے کیونکہ اسے احساس ہے کہ اب اس
کا درد چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔ ڈاکٹر کے پاس پہنچ کر وہ صحت وسکون اور راحت وآرام
سے ہمکنار ہو جائے گا۔ آزاد معاشرے میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ مریض ڈاکٹر کی ذات پر
شک کرے۔ اگر کبھی ایسی نوبت آ بھی جائے تو اس کے لیے مریض کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا
جاسکتا بلکہ حقیقت میں یہ ڈاکٹر کی ہچکچاہٹ ہوتی ہے جو مریض کے دل میں شکوک وشبہات کو
جنم دیتی ہے اور یہ کسی جگہ بھی واقع ہو سکتی ہے۔

اس کے برعکس بعض دفعہ ایسے حالات واقع ہوتے ہیں کہ ان میں ڈاکٹر اور مریض
کے مابین ہیئت تعلق تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی جرمن مریض فرانسیسی
ڈاکٹر کے پاس علاج کے لیے جائے گا تو اس کی حسرت ہو گی کہ ڈاکٹر اسے زندہ واپس بھیج
دے۔ کیونکہ غیر ملکی ڈاکٹر پر اسے اعتماد نہیں ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ ان
حالات میں ایک سرجن مقامی مریض کے ساتھ مختلف رویہ بھی اختیار کر سکتا ہے کہ وہ مریض

کا آپریشن بہت زیادہ احتیاط سے کرے کیونکہ اسے پتہ ہوتا ہے کہ اگر دوران آپریشن
مریض چل بسا تو اس کی موت کا جواز فراہم کرنے کے لیے اس کے پاس نیک نیتی اور فرض
شناسی کے سوا اور ہے ہی کیا۔

نو آبادیاتی علاقے میں اس طرح کے معاملات اکثر واقع ہوتے رہتے ہیں۔
اور جب ہسپتال میں کسی الجزائری کی موت واقع ہو جائے یا یہ کہ وہ کسی شدید زخم سے دوچار
ہو جائے تو اس کو یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا کہ یہ ڈاکٹر کے ہنگامی فیصلے اور جلد بازی کی وجہ سے
ہوا، ورنہ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات مقامی لوگ استعمار
نواز ڈاکٹر کے پاس جانے سے انکار کر دیتے ہیں کیونکہ انہیں اس بات کا پورا احساس ہوتا
ہے کہ وہ ان سے غیر انسانی سلوک کرے گا اور علاج یا آپریشن کے عمل کو اس قدر طویل
کر دے گا کہ وہ فریقین کے لیے ناقابل برداشت ہو جائے گا۔ لیکن ڈاکٹر کے لیے یہ چیز
کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے۔

کئی سال گزر جانے کے بعد بھی الجزائر کے مقامی لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ ہسپتال
جانے سے گریز کرتے ہیں خواہ فرانسیسی ڈاکٹر کتنا ہی بضد کیوں نہ ہو کہ مریض کی طرف سے
ذرہ بھر لاپرواہی ناقابل تلافی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ لیکن اس خوف و ہراس کے
باوجود وہ ہسپتال جانے کے بجائے اپنے گھر واپسی کو ترجیح کرے گا۔ شاید ہی کبھی کوئی ایسا
موقع آیا ہو کہ جب مریض نے ڈاکٹر کے پاس جانے کی رضامندی ظاہر کی ہو۔ یہ صرف
ایسے مواقع پر ہوتا ہے کہ جب مریض کی صورت حال ناگفتہ بہ اور مبالغہ آرائی کی حد تک
خطرے سے دوچار ہو چکی ہو اور ڈاکٹر کے پاس پہنچنے سے زندگی واپس آنے کی امید ہو۔
ایسی صورت حال میں بھی مریض فوری طور پر فرانسیسی یا غیر ملکی ڈاکٹر کے پاس جانے پر
رضامندی ظاہر نہیں کرے گا بلکہ اپنے گروپ یا خاندان کے لوگوں کے سامنے مسلسل پس و
پیش سے کام لے گا اور یہ چیز اس کے لیے بعض دفعہ موت کا سبب بن جاتی ہے۔

بارہا ایسے واقعات سامنے آنے کے بعد ڈاکٹروں کے بارے میں مقامی لوگوں کو
غالب گمان ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ ظالم ہیں خواہ ان کا تعلق مسیحائی پیشے سے ہی کیوں نہ
ہو۔ فرانسیسی لوگ مقامی باشندے کے ہسپتال نہ جانے کو متعصبانہ رویہ سے منسوب
کرتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ لوگ مریض کو ہسپتال بھیج کر خود کو گنہگار تصور کرنے
لگتے ہیں اور اپنے دل ہی دل میں وہ پچھتا رہے ہوتے ہیں کہ آئندہ خواہ کچھ بھی ہو ایسی
غلطی کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ اس مکتبہ فکر و عمل کے لوگوں کا غصہ عارضی طور پر تو ماند پڑا
جاتا ہے لیکن جب کبھی ان کے سامنے ایسی مثال آتی ہے تو ان کے غم و غصہ میں خطرناک
حد تک اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک اور بات قابل غور ہے کہ ان لوگوں کو استعماریوں
کے اپنے ممالک میں بسنے والی دیہی آبادی سے مماثل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مقامی لوگ
نو آبادیاتی فرانسیسی ہسپتالوں میں جانے سے اس بنیاد پر انکار نہیں کرتے کہ ان کا گھر شہر
سے دور ہے۔ نہ انہیں یہ غم ہوتا ہے کہ اس دوران انہیں اپنے دوستوں اور اہل خانہ سے
دور رہنا پڑے گا بلکہ ان کے ذہن میں اصل یہ خوف ہوتا ہے کہ اگر ایک مرتبہ وہ ہسپتال
میں داخل ہو گئے تو استعماری ڈاکٹر دوران علاج انہیں موت کی بھینٹ نہ چڑھا دے۔
ان کے لاشعور میں یہ بات چھپی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مریض کو اجنبیوں اور فاتح لوگوں
کے ہسپتال بھیج رہے ہیں۔

شروع شروع میں جب لوگ یورپی ڈاکٹروں کے پاس جانے سے ہچکچاتے تو بعض
دانشور انہیں روایت پرست تصور کرتے کہ لوگ صدیوں سے سنیاسیوں اور حکیموں کے پاس
علاج معالجے کے لیے جانے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور ابھی تک اپنی اسی روایت پر سختی
سے قائم ہیں۔ عام آدمی کا تو در کنار، خود مقامی ڈاکٹر بھی اسی روایت پرستی کی رو میں بہہ کر
معمولی سی تکلیف پر حکیموں کو رخ کرتے۔ ہمارے ایک ساتھی نے بتایا کہ لوگوں کی
ڈاکٹروں کے پاس نہ جانے کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ ڈاکٹر مریض کے بخار کا اندازہ لگانے

کے لیے جدید سٹیتھوسکوپ جیسے جدید آلات استعمال کرتے ہیں جب کہ مقامی لوگ حکیموں کو نبض دکھانے کے عادی ہیں۔ اگر اس بات کی مزید وضاحت کی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ لوگ اس لیے بھی یورپی طریقہ علاج سے ہچکچاتے ہیں کہ اگر ایک دفعہ انہوں نے یہ اختیار کرلیا تو انہیں روایتی طریقہ علاج کو مکمل طور پر خیر باد کہنا پڑے گا۔ اور یہ بات انہیں کسی قیمت پر گوارا نہیں۔

ہمارے سامنے اس طرح کے کیس آتے رہتے ہیں کہ ایک مریض کے بقول ''اگر میں حقیقت چھپا کر اپنی بیمار بیوی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں تو مجھے ڈاکٹر کی طرف سے ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ اس لیے کہ جب وہ پوچھے گا کہ کیا معاملہ ہے اور میں کہوں گا میں روایتی طریقہ علاج کا عادی ہوں۔ جب میری بیوی کو سر درد ہوا تو میں نے روایتی طریقہ کے مطابق اس کے ماتھے پر گرم سلاخ کے ذریعے دراڑیں ڈال دیں۔ مزید برآں اگر میں اس طریقہ علاج کے حق میں بضد رہا تو ڈاکٹر مجھ پر برس پڑے گا۔ اس کے برعکس اگر میں اس کے سامنے یہ واضح کر دوں کہ ایسا کرتے وقت میں نے مطلق جہالت کا ارتکاب کیا تو اس سے ڈاکٹر کی انا کو تسکین پہنچے گی کہ ایک اور مقامی شخص مغربی کلچر سے متاثر ہو کر اپنی روایت کا دشمن ہو گیا''۔

حاکم اور محکوم کا ایک ہی زمان ومکان میں کسی ایک اقدار کو خراج تحسین پیش کرنا ممکن ہے۔ اگر کسی معاملے میں محکوم حاکم کے بنائے ہوئے اصولوں یا رویہ جات کی تعریف کر دیتا ہے تو فوراً دونوں تہذیبوں کی یکجہتی کی مہم شروع ہو جائے گی کیونکہ وقت کے جادوگروں کو دونوں تہذیبوں کے درمیان کچھ چیزیں مشترک نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں اور وہ اس موقع کو غنیمت جان کر اس سے فائدہ اٹھانا بہتر تصور کرتے ہیں۔

اس تعارفی ماحول کے بعد الجزائر میں حالات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اب ہمارے لیے جاننا ضروری ہو گیا ہے کہ وہاں فرانسیسیوں کی موجودگی میں مختلف بیماریوں اور وباؤں

عہدہ برآ ہونے کے لئے عوام الناس اور مجاہدین کو کن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا اور انہوں نے اپنے راستے میں آنے والی مشکلات اور صعوبتوں پر کس طرح قابو پایا۔

مریض کا ڈاکٹر کے پاس جانا

جب ایک مقامی شخص ڈاکٹر کے پاس اپنی بیماری کا معائنہ کرانے اور علاج معالجے کی غرض سے جاتا ہے تو اس کی طبیعت میں ہمیشہ تذبذب پایا جاتا ہے یعنی وہ ہر دفعہ نئی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے۔ جب ڈاکٹر مریض سے بیماری کے بارے میں کوئی سوال پوچھتا ہے تو وہ کوئی معقول جواب دینے سے قاصر رہتا ہے اور یہ چیز ڈاکٹر فوری طور پر برانگیختہ کر دیتی ہے۔ اس کیفیت کو خوف وہراس سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا جو کہ عموماً ایک مریض ڈاکٹر کے پاس جانے کے بعد محسوس کرتا ہے۔ ہم نے اکثر سنا ہے کہ جب کوئی تھکا ہارا اور درد وکرب کا مارا مریض ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو ایک اچھے معالج کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ مریض کو مایوسی کی دلدل سے نکال کر اس میں امید کی کرن پیدا کرتا ہے اور اس کا اعصابی تناؤ وقتی طور پر کم ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس نو آبادیاتی نظام میں معالج اور مریض کے تعلق میں حد درجہ فرق پایا جاتا ہے۔ جب ایک مقامی مریض کسی یورپی ڈاکٹر کے پاس آتا ہے تو ڈاکٹر کو مریض سے یہی توقع ہوتی ہے کہ وہ اس کے کسی سوال کا ٹھیک سے جواب نہیں دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر جلدی سے یہ سمجھ کر مریض کے معائنے سے فارغ ہو جاتا ہے کہ مریض جسمانی طور پر ٹھیک ہے، حالانکہ اس وقت مریض سخت اعصابی طور پر تناؤ کا شکار ہوتا ہے۔ اب ساری صورت حال کے پس پردہ ایک ہی محرک ہے، وہ یہ کہ ایک طرف ایک محکوم مریض اور دوسری طرف حاکم، استعمار کا علمبردار یورپی ڈاکٹر۔ یہی چیز مریض کو اعصابی تناؤ کا شکار بنا دیتی ہے۔ یہاں ایک صاحب نظر کو ڈاکٹر کے رویہ کا بغور مشاہدہ کرنے کے ساتھ ساتھ محکوم اور پسے

ہوئے مریض کی ذہنی کیفیت کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ جب وہ طبی معائنہ کروانے کے بعد ہسپتال سے رخصت ہوتا ہے تو اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سمجھتا ہے کہ مریض کو جسمانی طور پر کوئی خاص تکلیف نہیں، بس ذرا سی تلملاہٹ اور ذہنی بے چینی ہے جو بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔

اس کے برعکس مریض کو شکایت ہوتی ہے کہ جب ہم ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں تو سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتا ہے کہ میاں تمہیں کیا تکلیف ہے؟ اس کے علاوہ ہم سے ایسے ایسے سوالات پوچھے جاتے ہیں جیسے کہ ہم خود ڈاکٹر ہوں۔ مزید برآں ڈاکٹر یہ تصور کرتا ہے کہ ہم تندرست اور توانا ہیں اور اپنی تکلیف کے بارے میں فوراً آگاہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر کو اعتراض کہ ''مقامی لوگ بے ذوق اور غیر مہذب ہیں۔ مریض کو شکایت ہے کہ ہمیں ان ڈاکٹروں پر وشواس نہیں۔ ڈاکٹر سوچتا ہے کہ مقامی لوگ عقل سے عاری ہیں، انہیں اتنا بھی شعور نہیں کہ معالج کو اپنی بیماری کے بارے میں کس طریقے سے آگاہ کرنا ہے۔ مریض کو خدشہ ہے کہ ہم ہسپتال میں ڈاکٹر کے پاس آ تو جاتے ہیں لیکن ہمیں اس بات کا یقین نہیں ہوتا کہ ہسپتال سے واپسی کا کوئی راستہ ہے یا نہیں۔ اس کشمکش سے دوچار ہونے کے بعد آخر ڈاکٹر نرسوں اور دیگر سٹاف کی مدد سے مریض کا معائنہ شروع کرتا ہے اور پھر کوئی مخصوص نسخہ تجویز کرنے کی جسارت کرتا ہے جس پر مریض کم ہی عمل کرتا ہے۔ ڈاکٹر کے خیال میں مقامی لوگوں کے علاج کا کوئی طریقہ نہیں، بلکہ ان کے لیے تو مویشیوں کا ڈاکٹر ہونا چاہیے (یعنی استعمار نواز مغربی ڈاکٹروں کے نزدیک مقامی مریضوں کو طبی طریقوں سے صحت یاب نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان کا علاج مویشیوں کے طریقہ علاج سے ہی ممکن ہے)۔

ایک ماہر عمرانیات کے نزدیک اس مسئلے کا بنیادی محرک انتہا پسندی ہے، حالانکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایک مریض ڈاکٹر کے کلینک

سے فارغ ہو کر جاتا تو وہ اسے اپنے لیے فائدہ مند اور منافع بخش تصور کرتا کیونکہ خود کو مغربی طریقہ علاج سے نجات دلا کر وہ جس طریقے سے خوشی کا اظہار کرتا ہے، اس کے نزدیک یہ اپنے دشمن پر فتح پانے کے مترادف ہے۔ اس طرح ایک حاکم اور محکوم کے درمیان کشمکش کا سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مقامی مریض کا ڈاکٹر کے پاس جانا ایک آزمائش سے کم نہیں۔ جب ایک شخص اپنے علیل و بیمار بیٹے کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے تو اس کی حیثیت نہ صرف کسی ملک میں پسماندہ طبقے کے فرد سے بھی کم ہوتی ہے بلکہ اسے استعمار نواز ڈاکٹر کی طرف سے ہر وقت یہ دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کے ہاتھوں اس کے بیٹے کی موت واقع نہ ہو جائے۔ مقامی شہری کو اس ناگہانی موت کا ہر وقت ایسے دھڑ کا لگا رہتا ہے جیسے بیماری، بے روزگاری، ظلم و تشدد اور کمتری کا احساس۔ ان تجربات اور تجزیات کے بعد قارئین پر واضح ہو جاتا ہے کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جو ایک مقامی مریض کو ڈاکٹر کے پاس جانے سے روکتی ہے، اور اگر وہ بہ امر مجبوری چلا بھی جائے تو اس پر اعتماد نہیں کرتا۔ حقیقت کی نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ وہ استعمار نواز ڈاکٹر کا ذلت آمیز رویہ ہے جو مقامی مریض کو اس سے دور رہنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔

ایک مغربی ڈاکٹر کے کلینک میں مقامی شخص کسی قیمت پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس ڈاکٹر کو بھی اس بات کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ مقامی مریض نا چاہتے ہوئے اگر اس سے دوا لے بھی گیا تو اسے معقول طریقے سے استعمال نہیں کرے گا یعنی یا تو دوا کی خوراک کم لے گا یا اسے زیادہ مقدار میں استعمال کرے گا یا پھر ڈاکٹر کے تجویز کردہ نسخے اور ہدایت کے مطابق استعمال نہیں کرے گا۔ یہ ہیں وہ خاص امور جنہیں ڈاکٹر اچھی طرح نوٹ کر لیتا ہے۔ اس طرح مریض کی طرف سے ایک ڈاکٹر کے ذہن میں جو تاثر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ مریض ڈاکٹر کے پاس علاج معالجے کی غرض سے نہیں آیا بلکہ آنکھ مچولی کھیلنے کے لیے

آیا تھا۔ ایسے ضدی اور بے یقینی کے حامل مریض پر ڈاکٹر کا کوئی بس نہیں چلتا۔ ڈاکٹر مشاہدہ کرتا ہے کہ اس کی حتی المقدور یقین دہانی کے باوجود مریض اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے اور مسلسل بدگمانی کا شکار ہے۔

اس کے برعکس ڈاکٹر مریض کو اس کے روایتی حصار سے نکال کر جدت پسندی کی طرف لائے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنی طرف سے ہر حربہ آزماتا ہے، یہاں تک کہ مریض کی یقین دہانی کے لیے اپنی نرسوں اور دیگر اسٹاف سے بھی مدد لیتا ہے۔ لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق معاملہ مزید بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے اور حاکم ڈاکٹر اور محکوم مریض کے مابین نفرت کی خلیج کم ہونے کی بجائے مزید بڑھ جاتی ہے۔

مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ مریض ایک مرتبہ بدیسی ڈاکٹر سے معائنہ کرانے کے بعد دوبارہ رجوع نہیں کرتا حالانکہ ڈاکٹر موصوف کو اخلاقی طور پر ہدایت کرتا ہے دوائی استعمال کرنے کے بعد دوبارہ ضرور چیک کروالینا۔ یہ بات صرف زبانی کلامی حد تک نہیں بلکہ ڈاکٹر تحریری طور پر مریض کے نسخے پر لکھ دیتا ہے۔ ڈاکٹر دوبارہ مریض کی راہ دیکھتا رہتا ہے اس کی آنکھیں ترس جاتی ہیں لیکن یہ سب فضول ثابت ہوتا ہے۔ مقامی شہری ڈاکٹر سے دوبارہ اس وقت رجوع کرتا ہے جب مرض مزید شدت اختیار کر جاتا ہے۔ مریض کو دیکھ کر ڈاکٹر حیرت میں گم ہو جاتا ہے اور مریض سے استفسار کرتا ہے کہ تم نے یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے؟ بیماری پہلے کی نسبت خطرناک حد تک پہنچ چکی ہے اور تم ایک سال بعد دوبارہ آن ٹپکتے ہو، کیا کرتے رہے اتنے دن، وغیرہ وغیرہ۔ مریض جھجکتے ہوئے جواب دیتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب میں نے تجویز کردہ دوائی صرف ایک مرتبہ استعمال کی اور پھر اپنے کام میں اتنا مصروف رہا کہ دوبارہ دوا کھانے کا موقع ہی نہ ملا۔ بعض مریضوں کا اِستدلال ہوتا ہے کہ انہوں نے تجویز کردہ دوا بغیر کسی وقفے کے ایک ہی بار ہڑپ کر لی اور جب دیکھا کہ اس سے آفاقہ نہیں ہو رہا ہے تو دوبارہ ڈاکٹر کے پاس آنے کی زحمت کر لی۔"

عمرانیاتی نقطۂ نظر سے اس رویے کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ مریض کے ذہن میں ہوتا ہے کہ اس کی بیماری آہستہ آہستہ شدت اختیار نہیں کر رہی بلکہ اس پر بھوکے شیر کی طرح حملہ آور ہو رہی ہے، لہٰذا اس سے بخوبی عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ سوچتا ہے کہ کیوں نہ بیماری پر ایک ہی بار ہلا بول کر اسے جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ڈاکٹر کے تجویز کردہ نسخہ میں شامل تمام ادویات کو نتائج سے بیگانہ ہو کر ایک ہی بار میں ہڑپ کر لیتا ہے، لیکن ایسے میں پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ نتیجتاً مقامی شخص بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر کی دوائیوں کی نسبت صوفیا کے درباروں اور تعویز گنڈوں پر زیادہ بھروسہ کرنے لگتا ہے۔ اسے گمان ہوتا ہے کہ دوائی کھانے کے بجائے اگر وہ اپنے گلے میں تعویز باندھ لے اور کسی بزرگ کے مزار پر چڑھاوا چڑھا دے تو اسے اپنی خطرناک اور جان لیوا بیماری سے نجات مل سکتی ہے۔ اس طرح مریض کی صحت درست ہونے کے بجائے مزید بگاڑ کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس لیے مریض جادوگروں اور سنیاسیوں وغیرہ سے علاج کروانے کو نسبتاً ترجیح دیتے ہیں۔ انہیں اس بات پر مکمل وشواس ہوتا ہے کہ ان ٹوٹکوں سے وہ مرض سے نجات پا کر شفایاب ہو جائیں گے۔

حقیقت کے ادراک کے لئے کسی چیز کو اس کے اصل پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ جب ہم حالات و واقعات کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کر دیتے ہیں تو حقیقت پہ پردے پڑ جاتے ہیں اور اس دھندلے پس منظر میں حقیقت کا ادراک کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ مقامی لوگوں میں بیرونی غلبے کی وجہ سے ایک عجیب و غریب قسم کا غم و غصہ جنم لیتا ہے اور ان کی حتی المقدور کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح سے غیر ملکی جابر حکمرانوں کے سامنے نہ آئیں۔ وہ ہر دم اپنے آپ کو غیر ملکی سراغرسانوں کی نظروں سے اوجھل رکھنے کے درپے ہوتے ہیں، لیکن بہ امر مجبوری انہیں معاشی اور انتظامی امور بجالانے کی غرض سے نہ جانے کتنی بار حاکموں سے ملنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی اس طرح شکنجوں میں جکڑ دی گئی ہے کہ انہیں اپنی ضروریات

کی تکمیل کے لیے استعمار کے علمبرداروں کے سامنے کاسہ لیسی کرنی پڑتی ہے۔

استعمار کی ایک یہ بھی چال ہے کہ وہ مقامی معاشرے کو طرح طرح کی الجھنوں میں ڈال کر تذبذب کا شکار کر دیتا ہے۔ حاکم لوگ جب کسی ملک پر قبضہ کر کے معاشرے میں ظاہر ہوتے ہیں تو اپنی ہر رسم اور قدر کو مقامی معاشرے پر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان حالات میں مقامی لوگوں کے لیے اپنی اقدار و اطوار پر عمل کرنا نہ صرف مشکل ہو جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ ناممکن بھی ہو جاتا ہے اور اسے اپنے رسم و رواج اور عقیدہ و اقدار کی بقا کے لیے چور دروازہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں ظالم سامراج ایسا ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ مقامی لوگوں کے لیے سانس لینا تک محال ہو جاتا ہے اور حاکم ہر اُس رشتے کو زبردستی توڑنے کے درپے ہوتا ہے جو مقامی لوگوں نے اپنے حسن وعمل سے استوار کیا ہوتا ہے۔ زیادہ تر معاملات میں روایتی طور طریقوں پر عمل کرنے میں مقامی لوگوں کو بے حد دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ البتہ جہاں تک مغربی ہسپتالوں میں جدید سہولیات کا تعلق ہے، ان سے استفادہ کرنا محکوم عوام کی مجبوری بن جاتا ہے۔ اس طرح کسی مریض پر اپنے ہم منصب ساتھیوں کی طرف سے دباؤ مزید بڑھ جاتا ہے۔ وہ علاج معالجے کے سلسلے میں جدید ذرائع کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ دوسروں کو بھی ان کے استعمال پر مجبور کرتے ہیں اور نہ اپنانے کی صورت میں طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں۔ باقی جہاں تک روایتی طریقہ علاج کا تعلق ہے تو اسے مکمل طور پر نظر انداز نہیں کر دیا جاتا بلکہ جدید طرز پر تعمیر کیے گئے ہسپتالوں میں بھی انہیں بقدر ضرورت اپنانے میں عار محسوس نہیں کی جاتی۔ مقامی لوگ اس مفروضے پر بڑی شدت سے عمل پیرا رہے ہیں کہ ایک طریقہ علاج کے بجائے اگر دونوں سے استفادہ کیا جائے تو اس کے ثمرات زیادہ بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس طرح جب ایک مقامی آدمی بیماری سے دوچار ہو جاتا ہے تو جہاں وہ ڈاکٹروں کے پاس اپنے علاج معالجے کے لیے جاتا ہے وہاں اس کے ذہن میں مقامی حکیم یا سنیاسی کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

مقامی شخص بیمار ہونے کے بعد سوچتا ہے کہ پنسلین کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن حکیم یا گاؤں کا روایتی طریقے سے علاج کرنے والا سنیاسی بھی کم صلاحیت کا حامل نہیں۔ یہ سوچ کسی ثقافتی ردعمل کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے پس پردہ بہت سے سیاسی، نفسیاتی اور معاشرتی محرکات کام کر رہے ہوتے ہیں جن کا فوری تجزیہ ممکن نہیں۔ اس صورت حال میں مقامی شہری گومگو کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف اسے شدید بیماری کا سامنا ہے جب کہ دوسری جانب وہ جدید ذرائع اور وسائل کو اپنانے سے ہچکچاہٹ سے کام لے رہا ہے۔ اور اگر بادل نخواستہ وہ فرانسیسی ڈاکٹر سے دوائی لے بھی لیتا ہے تو اسے صحت مندی کا یقین نہیں ہوتا۔ اس سے ہمارے سامنے یہ کیفیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک مقامی شہری حاکم قوم کے معالجوں کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ نفسیاتی طور پر مقامی آدمی کے تذبذب کی ایک اور عجیب صورت حال سامنے آتی ہے کہ جب اسے جدید طریقہ علاج کے مطابق گولی (Tablet) کھانا پڑتی ہے یا انجکشن لگوانے کا مرحلہ آتا ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ رزم گاہ میں اپنے دشمن سے پنجہ آزمائی کر رہا ہے اور جتنی بار وہ دوائی کی خوراک (Dose) کھائے گا یا ٹیکہ لگوائے گا، نفسیاتی سکون ثبات حاصل کرنے کے لیے اتنی ہی مرتبہ روحانی اطمینان کی خاطر مقامی حکیم یا سنیاسی کا رخ کرے گا۔ یہاں ایک اور صورت حال سامنے آتی ہے کہ ایک طرف اسے شدید مرض کا سامنا ہے جب کہ دوسری جانب وہ نفسیاتی کرب کا شکار ہے۔ اس طرح بیماری نئی صورت حال اختیار کر لیتی ہے اور وہ اپنے آپ کو چکی کے دو پاٹوں میں پستا ہوا پاتا ہے کہ نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن۔

محکوم اور مقامی ڈاکٹر

استعمار کی یہ صورت حال بظاہر ایک ڈاکٹر اور مریض کا منظر معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے پس پردہ بہت سی تلخ اور گہری سازشیں چھپی ہوئی ہیں جن کو کسی قیمت پر جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

استعماری نظام میں ڈاکٹر حقیقتاً ایک آلہ کار کے طور پر اپنا کام کرتا ہے۔ وہ اس نیٹ ورک کا حصہ ہوتا ہے جس نے اپنے خونی پنجے محکوم معاشرے میں گاڑے ہوتے ہیں۔ اب اس مفروضے کو افریقی معاشرے کے پس منظر میں دیکھتے ہیں کہ استعمار نواز حکمرانوں نے معاشرے میں اپنی جڑیں مزید مضبوط کرنے اور اسے جدید رنگ میں رنگنے کیلئے جب میڈیکل کے مقامی طلبہ کو تربیت دی تو یہ مقامی ڈاکٹر بھی استعمار کی بولی بولنے لگے۔ ان کے ہر اقدام کا مقصد استعمار کی جڑیں مضبوط کرنا تھا۔ یہ نہ صرف غیر ملکی حاکموں کی ہر بات پر لبیک کہتے اور پوری دلجمعی کے ساتھ ظالم اور طاغوت حکمرانوں کے ناحق پیمانوں کا احترام کرتے بلکہ ان کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے استعمار نواز حاکموں کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے۔ مقامی ڈاکٹروں نے مکمل طور پر مغربی ڈاکٹر کا روپ دھار لیا۔ وہ مقامی لوگوں کی نمائندگی کرنے کے بجائے خود کو مغربی حاکموں کا پروردہ سمجھنے لگے۔ محکوم معاشروں میں ڈاکٹر کو پولیس آفیسر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مقامی شہری ایک مرتبہ پھر دوہرے مطمع نظر کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وہ اپنے ساتھی کو مغربی ڈاکٹر کے روپ میں دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتا ہے جب کہ دوسری جانب وہ ذاتی طور پر اس طریقہ علاج اور اس تکنیک کو ذہنی اور عملی طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اس کے برعکس مقامی ڈاکٹروں کے مطمع نظر اور ویژن (Vision) میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ انہوں نے اپنے ملک کے روایتی طریقہ علاج کو معاندانہ نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ عقل وخرد کی نئی کائنات سے متعارف ہونے کے بعد وہ جدید طرز علاج کو نہ صرف نظریاتی طور پر درست خیال کرنے لگے بلکہ اسے عملی طور پر اپنانا ان کی مجبوری بن گئی۔ وہ اپنے ہم عصر اور ہم وطنوں کے مقامی اور دیسی طریقہ علاج، جادو اور ٹونے سے نفرت کرنے لگے۔

اس مقام پر مقامی ڈاکٹر کے مطمع نظر میں تبدیلی نے اس کے لیے ایک نئی جہت متعین کر دی۔ یہی ڈاکٹر جب مقامی اور دیسی طریقہ کے مطابق مریضوں کا علاج کرتا تھا لوگ

اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے لیکن جب سے وہ مغربی رنگ میں رنگا گیا، اس کے اور مریضوں کے مابین نفرت کی ایک دیوار حائل ہو گئی۔ وہ خود کو ایک مشکل سے دوچار پاتا ہے۔ مقامی ڈاکٹر کو جدید یورپی طرز علاج اپنانے میں کوئی عار نہیں لیکن نفسیاتی طور پر ایک مقامی ڈاکٹر کا جدید معالج کے روپ میں آنا خود اس کے لوگوں کے حق میں نہیں۔ کیونکہ اس نے صرف علاج معالجے کی حد تک جدید طریقہ علاج کو اپنایا لیکن جہاں تک استعمار کے عزائم کا تعلق تھا، ڈاکٹر اپنے آپ کو ان کا آلہ کار سمجھتا اور یہ چیز اسے بے چین کر دیتی۔

ایک فرانسیسی ڈاکٹر صرف غیر ملکیوں کا علاج کرتا جب کہ ایک الجزائری یعنی مقامی ڈاکٹر کو ہر دو طرح کے مریضوں کا علاج کرنا پڑتا، جن میں مقامی لوگوں کے علاوہ فرانسیسی، جرمن اور انگریز بھی شامل تھے۔ اس چیز نے مقامی ڈاکٹر کو خطرناک صورت حال سے دو چار کر دیا۔ اس حساس اور نازک موڑ پر ہم یہ چیز دکھانے کی کوشش کریں گے کہ مغربی رنگ میں رنگے ان مقامی ڈاکٹروں نے آزادی کی جنگ میں کیا کردار ادا کیا، ان کی سوچ میں کیا تبدیلی رونما ہوئی، انہوں نے کس طرح مقامی دانشوروں سے متاثر ہو کر استعمار کا چہرہ بے نقاب کر کے آزادی کی تحریک کو پروان چڑھایا اور بالآخر اپنے صدق وعمل سے اس کی تکمیل کر دی۔

تحریک آزادی میں مغربی ڈاکٹر کا کردار

تحریک آزادئ الجزائر کے دوران غیر ملکی ڈاکٹروں نے مقامی لوگوں کے ساتھ استعمار کی آڑ میں ذلت آمیز رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے ڈاکٹروں کے روپ میں، جس کا کام قعر مذلت میں گرے لوگوں کی مسیحائی کرنا ہوتا ہے، حاکموں کے آلہ کار کے طور پر فرائض سرانجام دیے۔ انہوں نے شاہانہ طرز رہائش اختیار کر رکھا تھا جو کہ عروس البلاد کے شہریوں کو کم نصیب ہوتا ہے۔

مزید برآں نوآبادیاتی کالونیوں میں ڈاکٹروں نے جاگیرداروں کا روپ دھار لیا۔ پورے الجزائر میں بمشکل ہی کوئی ایسی مثال ملے گی جس میں ڈاکٹروں نے بڑے بڑے زرعی فارم نہ بنا رکھے ہوں۔ یہ ڈاکٹر زمین کے بہت بڑے حصے کا مالک تھا خواہ یہ جائداد اس نے اپنے اجداد سے ورثے میں پائی ہو یا خود لوٹ مار سے اس کے حقوق ملکیت حاصل کیے ہوں۔ اس قدر ترقی پسند اور مہذب ہونے کے باوجود مغربی لوگ نوآبادیاتی علاقوں میں مقامی لوگوں سے مختلف معاشی ذرائع متعارف کروانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ نوآبادیاتی معاشرہ ایک موبائل یعنی چلتا پھرتا اور ناقص معاشرہ ہے لیکن اس ملک پر قابض ہونے کے بعد بیرون ملک سے آئے ہوئے وہ لوگ جنہیں اپنے آپ کو بہت مہذب ، چالاک پھرتیلے اور حاضر دماغ ہونے کا دعویٰ تھا اب انہوں نے عیاشی کی زندگی گزارنا شروع کردی حتیٰ کہ ان کو آئے ہوئے بہت کم عرصہ ہوا ہے وہ بھی اپنی ذات کو اس تبدیلی سے ماورا نہیں پاتے۔

یورپی باشندہ الجزائر، مراکش اور تیونس جیسے ممالک میں خود کو ایک جمود کا شکار شہری تصور نہیں کرتا بلکہ ہر وقت وہ معاشی طور پر مضبوط ہونے کی سرگرمیاں جاری رکھتا ہے۔ ہر ڈاکٹر کا اپنا مچھلی فارم ہے، ہر ڈاکٹر نے مویشی پالنے کا دھندا اختیار کر رکھا ہے وکیل اپنا پیشہ وکالت کے ساتھ بڑی سطح پر چاولوں اور دیگر اجناس کی خرید وفروخت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح یہ معاشرہ ایک جگہ پر رکا ہوا نظر نہیں آتا بلکہ باہر سے آنے والا ہر شخص ایک نئی دنیا تعمیر کرنے میں مگن نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ صورت حال اس قدر پیچیدہ اور مبہم ہوگئی کہ صناعوں، نوکر شاہی (Bureaucracy) مزدوروں اور دیگر پیشہ وروں میں فرق کرنا مشکل ہوگیا اس معاملے میں ڈاکٹروں سے دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی نسبت زیادہ لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ وہ صرف اپنے پیشے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ ملوں، فیکٹریوں، شراب کی بھٹیوں اور باغات کا مالک ہے۔ طب صرف اس

کا ذریعہ آمدن ہے۔ اس کا انحصار صرف اپنے پیشہ پر نہیں بلکہ وہ اچھی خاصی جائیداد کا مالک ہے خواہ یہ قابل انتقال جائیداد کی صورت میں ہو یا نا قابل انتقال جائیداد کی صورت میں ہو۔ اس کی ہوس نے اسے اپنے پیشے سے اس قدر متنفر اور دور کر دیا ہے کہ مقامی مریضوں کے ساتھ اس کا رویہ بہت غضبناک ہوگیا ہے۔ انہیں دیکھتے ہی اس کا موڈ خراب ہو جاتا ہے اور وہ فخریہ اور نفرت آمیز لہجے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے ان جاہلوں کا علاج کرنے کا کوئی شوق نہیں اور نہ ہی میں ان مریضوں کی آمدن کا بھوکا ہوں۔ اس لیے چند ٹکوں کی خاطر میں یہاں مسلسل نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ ہیں وہ خیالات وافکار جن کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا رہتا ہے۔ جہاں تک ڈاکٹر کے پیشہ کا تعلق ہے اس کا کام بیمار اور تھکے ماندے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنا ان کو صحت یاب کرنے کے لیے مسلسل ریاضت کرنا بھی اس کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ اس کے پیشے کا تقاضا ہے کہ انسانیت کی بنیادوں پر مریضوں کی رائے کا احترام کیا جائے اور جمہوری روایات کو فروغ دیا جائے۔ لیکن نوآبادیاتی نظام میں ایک ڈاکٹر استعمار کے علمبرداروں کا آلۂ کار بن کر لوٹ مار کے لیے مسلسل راہ ہموار کرتے ہیں۔ اور ہمیں یہ جان کر قطعاً ورطۂ حیرت میں گم نہیں ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر اور طب کے پروفیسر نوآبادیاتی نظام کے لیے رہنما کا کردار ادا کر کے استعمار کی حمایت کرتے ہیں۔

الجزائر میں ڈاکٹر مقامی لوگوں کے خلاف 'فوجی آپریشن' میں ہر طرح کی دلچسپی لیتا ہے اور اس کے سامنے اخلاقی ضابطے اور اقدار کی کوئی اہمیت نہیں اس کا کام صرف شاہانہ زندگی گزارنے کے لیے آسائشیں اکٹھی کرنا ہے اور یہ آسائشیں اسے نوآبادیاتی کالونی میں فراوانی کے ساتھ میسر ہوتی ہیں۔ بعض اوقات وہ مقامی لوگوں اور جہادیوں کے خلاف آپریشن میں اس قدر ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے کہ لگتا ہے اس کا کام بیماروں کا علاج نہیں بلکہ "دہشت گردوں کی بیخ کنی کے لیے ملائشیا، چیف یا منظم کا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ نو

آبادیاتی شہروں میں امن کا دور اسے کہا جاتا ہے جب آزادی کے متوالے استعمار نواز فوجی دستوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتے۔ ایسے میں ایک چرواہا دانشور کے روپ میں پستول لے کر جاتا ہے اور ڈاکٹروں کے دفتر پر ہلہ بول دیتا ہے۔

اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ بہت خطرناک جنگ ہے۔ جو اس وقت الجزائری لبریشن فرنٹ اور فرانسیسی غاصبوں کے درمیان لڑی جا رہی ہے۔ اس خون آشام جنگ نے پورے الجزائر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ جس میں ڈاکٹر تک مجاہدین کے غم وغصہ کا نشانہ بنے اور انتہائی بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ عالمی برادری اس بات پر حیران وششدر ہو کر رہ گئی کہ آخر آزادی کے متوالوں نے ڈاکٹروں کی اتنی بڑی تعداد کو کیوں ٹھکانے لگایا۔ اس کا سیدھا سا منطقی جواب اور جواز ہے کہ ان ڈاکٹروں نے اپنا انسان دوست اور مسیحائی پیشہ ترک کر کے استعمار کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے مہرے کا کردار ادا کیا۔ جس طرح ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے اسی طرح ان ڈاکٹروں کے ساتھ بھی ہوا۔ حالانکہ اس سے قبل 1944 میں مجاہدین آزادی کا ڈاکٹروں کے ساتھ رویہ بہت اچھا اور قابل تعریف تھا۔ عین محاذ آرائی کے وقت ہمارے ساتھیوں نے ایک آپریشن تھیٹر کا پہرہ دیا جب جرمن ڈاکٹر ایک مریض کا آپریشن کرنے میں مصروف تھے۔ آزادی الجزائر کی تحریک کی سیاسی قیادت جنگ کے قوانین سے بخوبی واقف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ روشن فکر ہونے کے ناطے وہ اس مسئلے کی پیچیدگی اور یورپی آبادکاروں کی ڈرامائی صورت حال سے بھی بے خبر نہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مسیحائی پیشہ کے علمبردار مسیحائی کے بجائے چنگیزیت کا کردار ادا کر رہے ہیں تو ایسی صورت حال کے پیش نظر مجاہدین نے ان ڈاکٹروں کے خلاف بھی وہی سلوک کیا جو کہ بیرونی حملہ آور فوجیوں کے ساتھ روا رکھا۔

اس صورت حال کو اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو بآسانی یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ مغربی ڈاکٹروں نے اپنے گرد بنے مضبوط حفاظتی حصار کو خود اپنے ہاتھ سے توڑا اور

بے بس ولاچارگان مریضوں کی دیکھ بھال کو چھوڑ کر فوجیوں اور کمانڈوز کا روپ دھارا۔ جہادیوں کے نزدیک آزادی کی اس جنگ میں مارے جانے والے ہر ڈاکٹر کو جنگی مجرم خیال کیا جاتا ہے۔ نوآبادیاتی نظام میں ایسے واقعات خصوصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس علاقے میں ڈاکٹر کی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے کہ لوگوں کو علاج معالجے کی سہولتیں فراہم کرے، وہ اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے بجائے قصابوں کا رویہ اختیار کرنے اور لوگوں پر ظلم روا رکھنے کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیتا ہے۔ حکام بالا اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے ڈاکٹر کو ایک زبردست اور مفید قسم کا مہرہ تصور کرتے ہیں کیونکہ وہ ہر وقت مریضوں کے ساتھ میل جول رکھتا ہے۔ اس طرح جب کوئی مقامی شخص زخمی حالت میں ڈاکٹر کے پاس آتا تو ڈاکٹر کا رویہ ایک طبیب کے بجائے خفیہ فوجی افسر کا ہوتا اور اسے زخم کے بارے میں ذرا سا بھی شک ہو جاتا کہ یہ کسی جنگی ہتھیار کے ذریعے لگا ہے تو وہ مریض کے تمام کوائف کے بارے میں دلچسپی لینے لگتا اور اپنے ریکارڈ میں مریض کا نام، پتہ، ولدیت، جگہ اور پیشہ جیسی تمام تفصیلات درج کر کے فوج کے حوالہ کر دیتا۔

استعماریوں نے اس حوالے سے اس قدر سختی کی اور اپنی بربریت کا جال بچھایا کہ فارماسسٹوں یعنی دوا فروخت کرنے والے کو اس قانون کا پابند کر دیا کہ کسی ڈاکٹری نسخہ کے بغیر کسی مریض کو پینسلین، اینٹی بائیوٹک، الکوحل یعنی سپرٹ اور روئی جیسی چیزیں قطعاً فراہم نہ کی جائیں۔ مزید برآں دواساز اور دوا فروخت کرنے والے اداروں کو حکم جاری کیا گیا کہ کسی شخص کا نام پیشہ اور علاقہ درج کیے بغیر اسے قطعاً دوا نہ دی جائے۔

جب لوگوں کو ڈاکٹروں اور دوا فروخت کرنے والے فارمسٹوں Farmsists کے اس رویہ کی حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے یہ ذہن بنا لیا کہ یہ ڈاکٹر اور اس پیشے سے وابستہ دیگر افراد کا مقصد حیات اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے یورپی آقاؤں کی خوشی کے لیے آلہ کار کے طور پر کام کریں۔ البتہ بعض میڈیکل سٹور مقامی لوگ چلا رہے تھے اور وہاں سے اس

بات کا خدشہ تھا کہ وہ مریضوں کا نام پتہ درج کیے بغیر انہیں ادویات فراہم کریں گے۔ اس چیز پر قابو پانے کے لیے مقامی فارمیسیوں کے قرب و جوار میں سول کپڑوں میں ملبوس پولیس آفیسر تعینات کردیے گئے جو فارمیسی مالکان کے رویہ کا جائزہ لیتے اور خلاف ورزی کی صورت میں خفیہ ایجنسیوں کو رپورٹ کردیتے جو بعد ازاں نام نہاد قانون کے تحت ان دوا فروخت کرنے والے اداروں کا لائسنس ضبط کر لیتے۔ اس خوف و ہراس کی وجہ سے بعض علاقوں میں دوا مفقود (Short) ہوگئی۔ تہذیب کے علمبرداروں اور انسانیت کے نعرے لگانے والوں نے الکوحل، ٹیکے لگانے والی سرنجیں اور روئی جیسی عام چیزیں عوام کو فراہم کرنے سے انکار کردیا۔ جس کے نتیجے میں خود فرانسیسی اعداد و شمار کے مطابق ہزاروں کی تعداد میں مریض تڑپ تڑپ کر دم توڑ گئے اور استعمار نواز حکمران اس جانکاہ صورت حال پر خاموش تماشائی بنے رہے۔

ایک حاکم ڈاکٹر نے مقامی لوگوں کے ساتھ سخت گیر رویہ روا رکھا۔ اور جب پولیس کی حراست میں ہلاک شدگان کا معاملہ تحقیقات کے لیے عدالت میں پیش کیا گیا تو وہاں سرکار نے معاملے کو رفع دفع کرنے کے لیے ڈاکٹروں کا بھرپور ساتھ دیا۔ ڈاکٹروں نے عدالتوں میں اپنی تیار کردہ رپورٹس میں لکھا کہ مریضوں کی ہلاکت پولیس کی نگہداشت میں نہیں ہوئی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ سینئر عدالت نے مقامی ڈاکٹروں کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ مریض کی ہلاکت کے بارے میں عدالت کو تفتیشی رپورٹ پیش کریں ڈاکٹر نے رپورٹ میں لکھ دیا کہ مریض کی ہلاکت دوا نہ ملنے اور ٹارچر کرنے سے ہوئی۔ اس کے بعد عدالتوں میں مقامی ڈاکٹروں کی تعیناتی روک دی گئی۔ اسی طرح یورپی ڈاکٹر قانونی اتھارٹی کو کسی مقامی شخص کی قدرتی موت واقع ہونے کی صورت میں سرٹیفکیٹ جاری نہیں کرے گا جنہیں کسی دور میں پولیس نے زیر حراست لینے کے بعد اس طرح تشدد کا نشانہ بنایا جس کے اثرات فوری طور پر تو ظاہر نہ ہوسکے البتہ بعد ازاں نتیجہ موت کی صورت میں نکلا۔ جب ورثاء نے اپنے کسی عزیز کی لاش کے

[illegible] کی اجازت طلب کی تو اسے سرکار کی طرف سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

یورپی ڈاکٹروں نے روح فرسا مظالم کی تکمیل کے لیے نوآبادیاتی اور استعماری [illegible]وں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اپنے مفروضے کو ثابت کرنے کے لیے ہم فرانسیسی [illegible]کل کور Medical Course کی چند مثالیں درج کرتے ہیں۔

ڈاکٹر حضرات آپریشن کے دوران ایک نشہ آور دوا استعمال کرتے ہیں تاکہ آپریشن کے وقت مریض کو ہونے والی تکلیف سے بچایا جاسکے۔ اس وقت مریض کا شعور کام کرنا [illegible] دیتا ہے اور لاشعور (Unconsioness) مسلسل کام کرتا رہتا ہے۔ لیکن جدید [illegible]ات کے مطابق اس دوا کا استعمال بعض اوقات منفی اثرات چھوڑتا ہے کہ اگر آپریشن کی [illegible]دگی کی وجہ سے مریض بے ہوشی کی حالت سے جاگ جائے تو اس کا نقصان ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ طب کی دنیا میں تھیراپی کے ذریعے علاج کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں کیونکہ برمحل نہ ہو تو انسانی شخصیت بری طرح مسخ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

پوری دنیا میں طب کے ادارے اس طریقہ علاج کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور جو ڈاکٹر دوران آپریشن ان کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے تو حقیقت میں وہ طب کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کرتا ہے اور اگر کوئی ڈاکٹر محاذ جنگ پر اپنے فوجیوں کے ساتھ شانہ بشانہ فرائض سرانجام دے رہا ہے تو اسے چاہیے کہ اس پیشے کی قدر کرتے ہوئے ان اصولوں کی پاسداری کرکے اپنی انسان دوستی کا ثبوت دے۔ دنیا کے تمام ممالک میں نافذ العمل قانون کے مطابق مجرم ڈاکٹر کی سزا موت ہے۔ اس طرح کے جرائم کی مثالیں ہمیں جرمن تاریخ میں بکثرت ملتی ہیں جو کیمپوں میں معتبر افراد کے ساتھ روا رکھتے تھے۔

اس تصویر کا دوسرا رخ ہم الجزائر میں دیکھتے ہیں کہ ایک طرف یہ طریقہ علاج عالمی ضابطۂ قانون و اخلاق میں مجرمانہ حیثیت کا حامل ہے جب کہ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ استعمار کے علمبرداروں کے ساتھ ساتھ ان مغربی ڈاکٹروں نے ان عالمی اصولوں اور

ضابطوں کو کس طرح بالائے طاق رکھ کر مقامی لوگوں کا علاج کیا اور کتنے بے گناہ اور معصوم لوگ اس کی زد میں آئے۔ یہاں ہم ایک مغربی ڈاکٹر ہی کے تاثرات کا حوالہ دیتے ہیں جو اس نے اپنی کتاب سوال The Questions میں واضح کیے ہیں۔

''ہمیں عقوبت خانوں میں مریضوں کے علاج کے کئی مواقع ملے۔ ہمارے پاس ایسے مریض آتے جن میں مرد اور خواتین دونوں طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ اور ہم اس طریقہ علاج (فزیوتھراپی) کے خطرناک نتائج سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود اسے استعمال میں لائے۔ علاج کے دوران اس طرح کے مسائل پیدا ہو جاتے کہ ہم ان میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے کہ ان قیدی مریضوں میں کون سے اس مرض کا شکار ہیں اور کون نہیں۔ اور اس کے علاوہ ہمیں اس بات کا حکم ہوتا تھا کہ اگر کسی بیماری کی تشخیص نہیں ہو پا رہی تو اسے واضح کرنے کے بجائے پوشیدہ ہی رکھا جائے۔ ان قیدیوں میں سے کوئی ایک قیدی ایسا نہیں تھا جو ظاہر یا خفیہ کسی انقلابی مہم کا حصہ نہ ہو۔ مغربی استعمار نواز فوجیوں کے مسلسل زدوکوب کے باوجود بھی قیدی کئی ماہ تک اپنا نام پتہ اور دیگر تفصیلات نہ بتاتے۔ اور جب بھی کوئی ایسی صورت حال سامنے آئی تو قیدی کو مسلسل تشدد کے ظلم سے گزرنا پڑتا۔ اسی طرح میرے (مصنف) علاوہ کئی دیگر ڈاکٹروں کو بھی اس چیز کا خطرناک حد تک تجربہ ہوا کہ انہوں نے وقفے وقفے سے کئی قیدیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا پھر اس کی کھو پر مرہم لگایا، ذرا سا زخم مندمل ہونے کے بعد پھر وہی تشدد''۔ لیکن انقلابیوں کے لیے سب سے اہم بات ہوتی تھی کہ ٹارچر سیل کے انچارج سے اپنی حقیقت کو مسلسل پوشیدہ رکھیں۔ کیونکہ انقلابیوں کا معاملہ

تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

والا ہوتا تھا۔ لیکن استعمار نواز ڈاکٹروں کو ہدف دیا جاتا تھا کہ قیدیوں سے ان کے ضروری لوازمات حاصل کریں۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے یہ ڈاکٹر ایک قیدی سے نام پتہ پوچھتے اور انکار پر اسے زدوکوب کرتے۔ جب وہ زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہو جاتا

[illegible] ڈاکٹر اسے وٹامن اور دیگر ادویات کی خوراک (Doze) دیتے تاکہ اسے مرنے سے بچا لیں اور پھر اپنے تشدد کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ لیکن دوسری طرف قیدیوں کا معاملہ [illegible] کہ وہ اپنے انقلابی مشن کے لیے جان تک کی بازی لگانے سے گریز نہ کرتے۔

الجزائر میں واقع ہر مغربی کیمپ میں یہ انسانیت سوز سلوک ایک عام بات ہے۔ ایک [illegible] ڈاکٹر سے متعلق انسان دوستی، محبت، مروت، احساس و قربانی وغیرہ کے تمام جذبات کو بالائے طاق رکھ کر قیدیوں سے بربرانہ، غیر مہذب اور انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا جاتا۔ یہاں تک کہ ماہر نفسیات جن کا طریقہ علاج خالصتاً نفسیاتی ہوتا کہ ایک مریض سے سوال و جواب کرے اس کی شخصیت کے بارے میں پتہ چلائے تاکہ مریض کے علاج میں مددومعاون ثابت ہو سکے۔ لیکن یہاں ماہر نفسیات بھی عقوبت خانوں میں ان پولیس افسران سے مل کر قیدیوں کو تشدد کا نشانہ بناتے اور اگر کوئی قیدی سوالات کا جواب دینے سے گریز کرتا تو یہی انسانیت کے علمبردار ماہرین نفسیات (Psychiatrist) ان قیدیوں کو بجلی کے جھٹکے دیتے اور بے ہوشی کے بعد پھر سوالات و جواب کا سلسلہ شروع کرتے یہاں تک کہ کئی مریض اس کشمکش میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور ان میں سے جو بچ جاتا وہ جسمانی اور ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ جاتا۔ ان مثالوں کے بعد اس بات میں ذرہ بھر شک نہیں رہتا کہ الجزائر میں استعمار نے مقامی لوگوں کے خلاف کس طرح کے مظالم روا رکھے اور مسیحائی پیشے کے دعویداروں کے ہاتھ بھی ان ہنستے لوگوں کے خون سے صاف نہیں ہیں۔

بھرم کھل جائے ترے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

الجزائر کے شہری، طبی طریقے اور جنگ آزادی

ان حالات و واقعات کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہمارے سامنے الجزائری لوگوں کی

پرائیویٹ اور عوامی زندگی کے بہت سے پہلو سامنے آئے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ استعمار نواز ڈاکٹروں سے تمام ضابطوں اور طبی اصولوں کو کس بے ضمیری کے ساتھ بالائے طاق رکھ کر بے گناہ لوگوں کو ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا۔ ایک نوآبادیاتی ملک میں شہریوں کی صحت بھی ان غاصبوں کے رحم وکرم پر ہوتی ہے۔ اور ان حالات میں اگر کوئی بیمار پڑ جائے تو اسے اس بات کا پورا پورا احساس ہوتا ہے کہ طبی امداد کے لیے اسے ایک ڈاکٹر کے علاوہ ایک منظم (Administrator) اور پولیس کانسٹیبل کے پاس بھی جانا پڑے گا نوآبادیاتی نظام میں ایک شہری کو اگر مثبت انداز میں تمام سہولتیں بھی فراہم کی جاتی ہیں لیکن وہ ہر وقت احساس تنہائی کا شکار رہتا ہے کیونکہ اسے یہ پتہ ہوتا ہے کہ استعمار نواز انتظامیہ بظاہر انہیں تمام سہولتیں بہم پہنچا رہی ہیں لیکن اس کے پس پردہ کوئی گہری سازش ہوگی۔ ان کا یہ خدشہ حقیقت کے بہت قریب ہے کیونکہ بعد ازاں حالات سے ثابت ہو جاتا ہے جب نہتے لوگوں کو عقوبت خانوں (Torture Cell) میں دیواروں کے پیچھے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

یہاں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ آزادی الجزائر کے ابتدائی ایام میں ہی فرانسیسیوں نے تشنج، مرگی اور اس طرح کی دوسری بیماریوں میں استعمال ہونے والی ادویات فروخت پر پابندی عائد کر دی۔ اور اگر کوئی الجزائری شہری اس دوا کا طالب ہوتا تو دوا فروخت (Pharmaist) کو اپنے نام، پتہ اور دیگر اطلاعات سمیت تمام کوائف بتانے کا پابند تھا۔ جب مقامی شہریوں نے یہ بات دیکھی تو فرانسیسی ڈاکٹروں کے پاس جانے کے بجائے خود ہی کوئی طریقہ علاج ایجاد کرنے کی کوشش کی۔ اس پر استعمار نوازوں کی حیرت بڑھ گئی کہ بیماری کے باوجود لوگ ڈاکٹروں کے پاس نہیں آ رہے۔ اس صورت حال کو کنٹرول کرنے کے لیے استعمار کے علمبرداروں نے مارکیٹ میں دوا فروخت پر پابندی عائد کر دی۔ آپریشن سے متعلقہ آلات بھی اس حکم نامے کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس طرح لبریشن وار یعنی آزادی کی جنگ میں مجاہدین کو شدید حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا یہاں تک کہ اگر کسی شخص کو جنگ میں ہلکا سا بھی زخم آ جاتا تو وہ مایوس ہو کر اپنے آپ کو گھر میں قید کر لیتا۔ کیونکہ مارکیٹ میں ویکسین کی فروخت کو نام پتہ کے ساتھ مشروط کر دیا گیا تھا جو کہ آزادی کے متوالوں کے لیے موت کے پروانے کے مترادف تھا۔

زخم کے معاملے میں یہ اصولی بات ہے کہ جب کسی شخص کو معمولی سا بھی زخم آئے تو اسے احتیاطی تدابیر کے تحت تشنج (Tatnus) کے خدشہ کے پیش نظر ویکسین (Vaccine) کا لگایا جانا ضروری ہو جاتا ہے لیکن یہاں یہ صورت حال ہوگئی کہ انسانیت کے نام نہاد علمبرداروں نے مارکیٹ سے دوا پر پابندی عائد کر دی۔ اس طرح کا مریض خود ہی زخم کو صاف کرتے اور سپرٹ وغیرہ کے استعمال سے زخم کو مندمل کرنے کی کوشش کرتے لیکن یہ عمل کہاں تک باور ثابت ہوتا۔ بالآخر آزادی کی جنگ میں زخموں سے دوچار ہونے والے مجاہدین پہلے تشنج کا شکار ہوتے اور جب مرض بڑھ جاتا اور زخم خطرناک صورت حال اختیار کر جاتا تو بے چارگی کی حالت میں وہ بلک بلک کر جان دے دیتے۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا آزادی کے متوالے پکڑے جانے کے خوف سے دوا خریدنے نہ جاتے بلکہ جب تک ان کے دم میں دم ہوتا زندگی سے لڑتے رہتے اور جب زندگی ہار دے جاتی تو قید کی ذلتوں اور رسوائیوں پر عزت کی موت کو ترجیح دیتے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ جب کوئی مریض کسی فرانسیسی بچے کو یہ دوائی یعنی Vaccine خریدنے کے لیے بھیجتا تو وہ بآسانی لے کر آ جاتا جسے حاصل کرنے کے لیے مقامی شہری [illegible] دوا فروش اداروں سے رابطہ کرتا لیکن ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا اس جدوجہد سے اس کا خوف اس قدر بڑھ جاتا کہ کہیں دوا کے حصول میں خفیہ ایجنسیوں کے ہاتھ نہ چڑھ جائے جو اس پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہوتی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ایک طرف سائنس کو تمام تعصبات سے بالا قرار دیا جاتا ہے وہ کسی مذہب، فرقے، سیاسی اقتدار جیسی تحریک کارستانیوں میں نہیں پڑتی بلکہ اس کا نام ان جغرافیائی، لسانی اور سیاسی جھگڑوں سے بالاتر ہو کر انسانیت کی خدمات بجالانا ہے لیکن مغربی استعمار کے علمبرداروں کے ہاتھ میں سائنسی ایجادات انسانیت کے حق میں رحمت کے بجائے زحمت اور فیض و برکت کے بجائے لعنت ثابت ہوئی۔ ایک مقامی شہری جو زخم صاف کرنے کے لیے ذرہ بھر روئی کے پھاہے کو مہینوں تک بھکاریوں کی طرح چھان مارتا وہی روئی بنڈلوں کے حساب سے استعماریوں نے اپنے قبضے میں لے کر ضائع کر دی لیکن انسانوں کو اپنے زخم صاف کرنے کے لیے دینا گوارا نہ کی۔ صورت حال اس قدر خطرناک ہوگئی کہ لوگوں نے پانی اُبال کر دیسی طریقوں سے اپنے زخم دھونے کی کوشش کی جس سے زخم مندمل ہونے کے بجائے

مزید بگڑ گئے بالآخر جسم کے ان حصوں کو کاٹنا پڑا۔ لیکن یہ تمام استعمار نواز ڈاکٹروں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا می نہم

وہ چیزیں اور ادویات جنگ کے ابتدائی ایام میں عارضی طور پر بند کی گئیں۔ اب تحریک آزادی کے دوران انہیں ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس طرح انقلابی یونٹوں کی ذمہ داریوں میں دوہرا اضافہ ہوگیا۔ ایک طرف ان کا کام استعمار کی طرف سے روا رکھے گئے ظلم کی نشاندہی کرنا اور شہریوں کو ان سے باخبر رکھنا تھا جب کہ دوسری طرف آزادی کے متوالوں کے زخموں کو مندمل کرنے کے لیے ادویات فراہم کرنا بھی ان لازم ہوگیا۔ انہوں نے یہ ذمہ داری انتہائی خندہ پیشانی سے قبول کی۔ الجزائری ڈاکٹروں، نرسوں اور دواساز اور دوافروش اداروں نے آلات جراحی کی تیاری میں دلجمعی سے حصہ لیا اور اپنے زخمی کارکنوں کو فراہم کر کے تحریک آزادی کو تقویت بخشی۔ اس کے علاوہ ہمسایہ عرب ممالک تیونس اور مراکش سے کثیر مقدار میں ویکسین اور دیگر آلات جراحی منگوائے گئے۔ اگرچہ استعمار نواز قوتوں نے اس کار خیر میں رکاوٹیں ڈالنے کے لیے تمام حربے استعمال کیے لیکن انقلابیوں نے غیر روایتی طریقوں سے ہمسایہ ممالک سے ادویات اسمگل کر کے مغربیوں کے تمام مذموم عزائم خاک میں ملا دیے۔ یہ طبی معرکے 1956ء اور 1957ء کے خطرناک اور نازک ترین دور میں پیش آئے جب تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔

جوں جوں آزادئ الجزائر کی تحریک آگے بڑھی۔ لبریشن فرنٹ نے اپنی جدوجہد تیز کردی اس کے ساتھ صحت کے میدان میں بھی بڑی ڈرامائی تبدیلیاں رونما ہوئیں، لیکن لبریشن فرنٹ نے اس صورت حال سے بخوبی عہدہ برآ ہونے کے لیے روایتی نظام سے ہٹ کر طریقہ اختیار کرلیا اور جن لوگوں کو فرانسیسی ڈاکٹروں کے پاس جانا پڑتا تھا اب ان کے لیے خصوصی طبی مراکز Medical Unit قائم کردیے گئے۔ اس طرح ایک مقامی یونٹ جو لوگوں کو طبی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے قائم کیا گیا۔ اپنے اس کارنامے کی وجہ سے بالواسطہ لبریشن فرنٹ کا معاون بن گیا۔ لبریشن فرنٹ انسان دوست سرگرمیوں کے ساتھ آگے بڑھا، استعمار نے بھی اپنے ظالمانہ پنجے گاڑنے کے لیے ظلم وتشدد بڑھا دیا۔ فرانسیسی فضائیہ نے لبریشن فرنٹ کا نیٹ ورک توڑنے کے لیے ان کے ٹھکانوں بمباری شروع

کردی اس سے ہزاروں نہتے لوگ موت کے منہ میں چلے گئے، آبادیوں میں طرح طرح کی بیماریاں پھیلنے لگیں۔ اور یہ بات پوری دنیا پر عیاں ہے فرانسیسی بمباری میں مجاہدین کے مقابلے میں اور بے گناہ شہری زیادہ تعداد میں شہید ہوئے۔ شماریات کے حوالہ سے یہ تعداد ایک کے مقابلے میں دس بنتی ہے۔ اور خود فرانسیسی فوج کے اعداد وشمار بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ لبریشن فرنٹ کے خلاف کارروائیوں اور محاذ آرائی میں گوریلا فورس کے مقابلے میں شہری آبادی کا زیادہ نقصان ہوا۔ ان نازک پیچیدہ اور جان کن حالات میں عام شہریوں کو طبی سہولیات فراہم کرنا اور بھی مشکل ہوگیا۔ شعبہ میڈیکل سے تعلق رکھنے والے طلبہ، نرسوں، ڈاکٹروں اور دواساز اداروں کو لبریشن فرنٹ میں داخل ہوجانے کی دعوت دی گئی۔ سیاست دانوں نے ڈاکٹروں اور انتظامیہ کے ساتھ مل کر خصوصی اجلاس بلائے جن میں معاملے کی نزاکت کو زیر بحث لایا گیا۔ ضروری مشاورت کے بعد تمام ڈاکٹروں نرسوں اور طالب علموں نے آزادی کی جنگ میں کودنے پر آمادگی ظاہر کردی۔ ہر کام انقلابی روح کے ساتھ انجام پایا کوئی ایک شخص ایسا نہ تھا جس نے منصوبے کی مخالفت کی ہو۔ نہ کوئی تذبذب کا اظہار ہوا نہ بزدلی دکھائی بلکہ تمام لوگوں نے اتفاق رائے استعمار کے خلاف جنگ آزادی کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنے میں فخر محسوس کیا۔

اس دوران ڈاکٹروں نے آزادی کی تحریک کو کامیابی سے دوچار کرنے کے لیے زیادہ پیچیدہ راستہ اختیار نہ کیا اور نہ ہی اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نفسیاتی حربے استعمال کیے بلکہ ان کے پیش نظر اولین فریضہ بڑی تعداد میں موت کی گود میں جانے والے بچوں اور خواتین کی زندگیوں کو بچانا تھا۔ اس جدوجہد کے بعد ہمارے لبریشن فرنٹ کے اس انقلابی اقدام کے بعد ہم پر یہ بات واضح ہوچکی ہے لوگوں نے روایتی طرز کو چھوڑ کر انقلابی انداز کو اپنا لیا۔ وہی لوگ جو پہلے بیماری کی صورت میں مقامی جوگیوں یا حکیموں کے پاس جاتے اور ان کی خاص ادویات اور ٹوٹکے استعمال کرتے تھے اب وہ جدید طبی سہولتوں کے استعمال پر مطمئن اور قانع نظر آنے لگے۔ تمام مکاتب فکر کے لوگوں نے استعمار کے خلاف جنگ میں اپنی غیر معمولی لیاقت روشن ضمیری اور سچے جذبوں کا عملی طور پر اظہار کیا۔

مقامی ڈاکٹر، الجزائری ڈاکٹر جو جنگ آزادی سے قبل استفسار کا آلۂ کار اور غیر ملکی ایجنٹ نظر آتے تھے اب وہ ایک انسان دوست اور وطن نواز معالج کے طور پر سامنے آئے اور

اپنے ذوق عمل سے تحریک آزادی کا حصہ بن کر ابھرے۔ اب ڈاکٹر موڈی (Moody) قسم کے اور کم گو نہیں رہتے بلکہ عام مریضوں کے ساتھ روابط کرنے اور بیماروں کی تیمارداری کرنے والے بن گئے۔ وہ عام لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے عام جگہوں پر سوتے اور سادہ لوح لوگوں کی طرح ان کا دسترخوان بھی سادگی اور انسان دوستی کی زندگی مثال بن گیا۔ اب وہ ہمارے ڈاکٹر ہیں، خالص ہمارے۔۔۔ اپنے ڈاکٹر۔۔۔ الجزائر کے سپوت۔۔۔ لوگوں کی آزادی اور صحت کے ضامن۔

الجزائر کے شہریوں کے سامنے ایک اور زندہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ جنگ آزادی سے قبل مقامی لوگ چاہتے تھے کہ جدت پسندی کی خاطر مغربی اور غیر ملکی ڈاکٹروں کے پاس جائیں اور ان کا طرز علاج اپنائیں۔ لیکن لبریشن فرنٹ کی انقلابی سرگرمیوں نے ملک کے چپے چپے میں میڈیکل سنٹر قائم کر دیے تاکہ تمام لوگوں کو بلاشرط و امتیاز طب کی سہولتیں میسر آ سکیں۔ اب لوگوں کو احساس ہوا کہ مغربی ڈاکٹر تو ایک ماہ میں چند دن ایک مقام پر بیٹھ کر لوگوں کو ادویات فراہم کرتے اور پھر غائب ہو جاتے لیکن ان کے لیے اپنے لوگوں یعنی مقامی باشندوں اور انقلابیوں کے قائم کردہ نظام میں کس قدر حسن ہے کہ انہوں نے بیماروں اور زخمیوں کے لیے ایسے شفاخانے قائم کیے جو بلاناغہ انہیں سہولت پہنچانے کے لیے مستعد رہتے ہیں مزید برآں مقامی لوگوں کے رویہ جات اور مطمع نظر (Print of view) میں بھی ایک خاص قسم کی تبدیلی آ گئی۔ پہلے وہ جدید طب کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ مثال کے طور پر جب مغربی ڈاکٹروں نے مقامی لوگوں کو مشورہ دیا کہ کھلی جگہوں پر رفع حاجت کے بجائے لیٹرین یعنی بیت الخلاء کو ترجیح دیں تو لوگوں نے ان کی اس بات کو ٹھکرا دیا اور اپنے پرانے طرز عمل کو ترجیح دی۔ لیکن جنگ کے دوران زخموں کو جراثیم سے پاک رکھنے کا عمل مقامی لوگوں کے لیے بہت زیادہ تخلیقی اور تعمیری ثابت ہوا، انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جنگی ہتھیاروں سے لگے زخم دیسی طریقوں سے مندمل نہیں ہو سکتے بلکہ ان کے لیے سپرٹ اور ایتھر جیسی چیزیں ناگزیر ہیں۔ اسی طرح لوگوں نے جان لیا کہ ایک طرف مغربی لوگوں کا انداز نظر مائل بہ زیرکی ہے لیکن دوسری جانب کے ایجاد کردہ سائنسی طریقوں میں نفاست اور جدت ہے۔ اب لوگوں نے جمود کی زندگی ترک کر کے جدت سیکھ لی۔ انہیں وہ اپنی اور بچوں سمیت پورے خاندان کی صحت بارے فکرمند ہو گئے۔ گھر گھر تک

صحت کی سہولتیں باہم پہنچانے کے لیے نئے طبی سکول کھولے گئے۔ نرسوں کو تربیت دی گئی ان پڑھ لوگوں کو بنیادی تعلیم کے بعد مریضوں کو ٹیکے (Injection) لگانے کی خدمت پر مامور کر دیا گیا۔

سائنسی میدان میں ترقی اور لبریشن فرنٹ کے قائم کردہ انقلابی اداروں کی بدولت لوگوں نے توہمات (Superstitions) پر یقین رکھنا ترک کر دیا۔ جن دیو پریوں اور چڑیلوں جیسی مخلوقات جن پر یقین رکھا لوگوں کی زندگیوں میں بنیادی حیثیت رکھتا تھا، آہستہ آہستہ ان چیزوں نے دم توڑنا شروع کر دیا۔ اب لوگ خالص تحقیقی اور سائنسی انداز میں سوچنے لگے۔ لوگوں کے مطمع نظر میں اتنی تبدیلی آ گئی کہ الجزائر جیسے پسماندہ ملک کے عوام کے لیے حساس ترین سائنسی اقدار کو اپنانے میں کوئی جھجک نہ تھی۔ وہ مغرب کے کسی بھی ترقی یافتہ اور صنعتی ملک کی طرح نئی چیز کو اپنانے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ اس مفروضے کو ثابت کرنے کے لیے یہاں ہم چند مثالیں درج کرتے تھے۔ جنگ کے آغاز میں لوگوں کو پتہ نہیں ہوتا تھا کہ زخمی لوگوں کی کسی طرح دیکھ بھال کرنی ہے لیکن لبریشن فرنٹ نے اس معاملے میں انقلابی کردار ادا کیا۔ اب ہر کس و ناقص آگاہ ہو گیا کہ اگر جنگ کے دوران کوئی شخص زخمی ہو جائے اور گولی وغیرہ اس کے پیٹ میں لگی ہو تو اسے پینے کے لیے پانی نہیں دیا جاتا۔ کیونکہ انتڑیوں میں خم ہونے کی وجہ سے انفیکشن کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ میں (مصنف) نے خود اپنی آنکھوں اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ ایک شخص جنگ آزادی کے دوران پیٹ میں گولی لگنے سے زخمی ہو گیا۔ تکلیف کی وجہ سے شدید پیاس اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔ اس نے پاس کھڑے بیٹے سے پانی مانگا لیکن بیٹے نے انکار کر دیا۔ مزید ضد کرنے پر بیٹے نے اپنے والد کو بندوق تھما دی اور کہا کہ اے میرے والد محترم اگر آپ چاہیں تو مجھے گولی مار دیں لیکن میں آپ کو پانی نہیں دوں گا کیونکہ یہ حلق سے اترتے ہی انفیکشن کر دے گا جس سے آپ کی زندگی بچنے کے بجائے مزید خطرے سے دوچار ہو جائے گی۔ اسی طرح ایک گاؤں میں ایک شخص محاذ جنگ سے شدید زخمی ہو کر آیا۔ گاؤں کی عورتوں نے روایت کے مطابق اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ وہ شخص بار بار پانی مانگتا رہا لیکن کسی نے اسے پانی دینے کی حماقت نہ کی کیونکہ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ تمام خواتین نے ڈاکٹر کے آنے تک مریض کو دلاسے دے کر بٹھائے رکھا۔ اور جب ڈاکٹر آن پہنچا کر خواتین کا رویہ دیکھ کر

بہت خوش ہوا۔ یہ تمام کریڈٹ لبریشن فرنٹ کو جاتا ہے جس نے ہنگامی بنیادوں پر لوگوں کی تربیت کی اور انہیں زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھایا۔

نو آبادیاتی نظام میں یہ چیزیں انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں ۔ استعمار نواز ڈاکٹروں کے ذریعے کیا گیا ہر کام مقامی لوگوں کو ایک اذیت معلوم ہوتی ہے جو بیرونی ڈاکٹر علاج معالجے کے نام پر مقامی لوگوں سے روا رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی مرض کا شکار مقامی شخص کو جب بازو میں انجکشن لگایا جاتا ہے تو وہ اسے تشدد سمجھتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس سے برعکس ہے۔ مردوں کے برعکس نو آبادیاتی نظام کے تحت خواتین نے بہت زیادہ روشن فکری دکھائی جب اس کا بچہ بیمار ہوتا تو وہ ڈاکٹر کی ہدایت اور تجویز کردہ نسخے کے مطابق عمل کرتی ہے۔

ماہرین صحت Specialists کو چاہیے کہ کسی بھی مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نئی تکنیکوں کا استعمال احتیاط سے کریں۔ اور لبریشن فرنٹ کے پلیٹ فارم پر کام کرتے ہوئے پسماندہ لوگوں کا معیار زندگی زیادہ سے زیادہ بلند کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب کوئی قوم سچے جذبے اور متحرک نظریے کے تحت کسی کام کا بیڑا اٹھا لیتی ہے تو کوئی چیز اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ استعمار نواز مفکرین نے مقامی اور پسماندہ لوگوں کے بارے میں جو ذلت آمیز لفظ استعمال کیے اور ان کو نفسیاتی طور پر پسماندہ رکھنے کی کوشش کی ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، وہ محض ایک جھوٹا پراپیگنڈہ ہے۔ جب لوگ اپنی قسمت کے اپنے ہاتھوں میں لے کر دل میں ایمان اور جذبات کی آگ بھڑکاتے ہیں تو وہ غیر معمولی قیمت پر بھی جدید ٹیکنالوجی حاصل کر کے رہتے ہیں تاکہ معاشی ایجادات اور اپنے ذوق عمل سے ایک نئی دنیا کو آباد کر سکیں۔

لاہور • حیدر آباد • کراچی •
e-mail:fictionhouse2004@hotmail.com

ISBN 978-969-562-184-4